خُداکی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

جلد :۔ ۱ شمارہ :۔ ۴۴

۱۸ ۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء

نگران

شوکت صدیقی ۔۔۔ محمود شام

مدیر

ارشاد راؤ

معاونین خصوصی

ابراہیم جلیس ۔۔۔ منہاج برنا

افضل صدیقی ۔۔۔ ایم کے جنجوعہ

نائب مدیران

اشرف شاد ۔۔۔ وہاب صدیقی

عکاس : الطاف رانا آرٹ : غلام نبی بزمی

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے :-	۶۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت ۔۔۔ ۶۰ فلس

دوبئی، قطر ۔۔۔ ۵، درہم

سعودی عرب ۔۔۔ ۱۵ قرش

انگلستان ۔۔۔ ۲ شلنگ، ۶ پنس

مقامِ اشاعت

دفتر ہفت روزہ الفتح ۸۰، ڈی نرسری کمرشل ایریا

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی ۔۔۔ ۲۹

ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ ۔ مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد، کراچی

مقالۂ خصوصی

بنگلہ قوم پرستی سازش کا شکار ہوگئی

صدر یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان اس ہفتہ ڈھاکہ میں مذاکرات شروع ہو جائیں گے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ ان مذاکرات کے نتیجے میں وہ سیاسی بحران بڑی حد تک ختم ہو جائے گا جو گذشتہ دو ہفتے سے شدید تر ہوگیا تھا۔ اس بحران کو بہرحال ختم ہونا ہی تھا۔ حالات کا یہی تقاضہ تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اس بحران کو جس منزل تک لے گئے ہیں۔ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ وہ مرحلہ اب قریب آگیا ہے جب خود شیخ مجیب الرحمٰن کو سیاسی بحران ختم کرنے کے لئے جھکنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ اس کے اسباب بہت واضح ہیں۔ مشرقی پاکستان میں عوام کا شعور جس قدر بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ معاشی مسائل کُھل کر سامنے آتے جا رہے ہیں اور جب معاشی مسائل زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ عوام میں اُن کا شعور پیدا ہو جاتا ہے تو عوامی جدوجہد واضح طور پر طبقاتی جدوجہد کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔

جب عوامی جدوجہد کا یہ مرحلہ آ جائے گا (اور شاید آ چکا ہے) تو مشرقی پاکستان کے عوام میں مغربی پاکستان کے خلاف جو نفرت پیدا کرائی گئی ہے وہ اُن استحصالی قوتوں کے خلاف طبقاتی جدوجہد میں تبدیل ہو جائے گی جو بیرونی سامراج کے اشتراک سے عوام کا استحصال کر رہی ہیں۔ یہ عوام مشرقی پاکستان کے بھی ہیں اور مغربی پاکستان کے بھی۔ اُن کے مسائل بھی مشترک ہیں۔ ان کے دُکھ بھی مشترک ہیں اور اُن کے دُشمن بھی مشترک ہیں لہٰذا اُن کی جدوجہد بھی مشترک ہے۔ اس مرحلے پر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے عوام کے درمیان نفرت کی جو دیوار کھڑی کر دی گئی ہے وہ گر جائے گی۔ عوام کی جدوجہد کا رُخ اپنے مشترکہ دُشمن کے خلاف ہوگا۔ یہ طبقاتی جدوجہد ہوگی۔ انقلابی جدوجہد ہوگی۔ عوامی لیگ اسی صورتِ حالات سے ڈرتی ہے۔ اس کے وہ اتحادی بھی ڈرتے ہیں جو مغربی پاکستان میں بیٹھ کر اس سرد سیاسی جنگ کو لڑا رہے ہیں۔

عوامی لیگ کا طبقاتی کردار کسی انقلابی جدوجہد کا، کسی طبقاتی جدوجہد کا ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا۔ عوامی لیگ کا طبقاتی کردار کیا ہے؟ وہ مشرقی پاکستان کی اُبھرتی ہوئی سرمایہ داری اور اس اُبھرتی ہوئی سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ اُبھرتی ہوئی نوکر شاہی کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ دونوں وہ طبقات ہیں جنھوں نے گذشتہ ۲۳ سال میں مغربی پاکستان کے بڑے جاگیرداروں، اجارہ دار سرمایہ داروں اور طاقتور نوکر شاہی کے ایجنٹ کی حیثیت سے عوام کے استحصال میں اپنا طبقاتی کردار ادا کیا ہے۔

پیداواری رشتوں کی تبدیلی کے ساتھ معاشی رشتوں میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے اس نے پاکستانی معاشرے میں تبدیلی پیدا کی اور اس تبدیلی کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں سرمایہ دار طبقہ اُبھرا۔ اب یہ طبقہ سیاسی قوت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ معاشی قوت حاصل کر سکے۔ مشرقی پاکستان کی اُبھرتی ہوئی قوم پرستی کا یہی مفہوم ہے۔

قوم پرستی اپنے تاریخی کردار کے اعتبار سے ایک ترقی پسند رجحان ہے۔ لیکن قوم پرستی کے دو واضح رُخ ہیں۔ اگر وہ عوامی قوتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے تو اس کا کردار جمہوری اور سامراج دشمن ہوتا ہے اور اگر وہ انانیت اور علیحدگی پسندی کا شکار ہو جاتی ہے تو عوام سے اس کا رشتہ کٹ جاتا ہے وہ جاگیرداروں اور بڑے سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کر لیتی ہے۔ بیرونی سامراج کا آلۂ کار بن جاتی

سازش کو ناکام بنا دیا تھا اور اس دفعہ بھی وہ اس سازش کو کامیاب نہ ہونے دیں گے۔

حقائق شاہد ہیں کہ یہ سیاسی بحران ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پیدا کیا گیا۔ ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ عوام، عوام کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہو جائے۔ انتخابات کے دوران اور اُس کے بعد ان میں استحصالی قوتوں کے خلاف جو اتحاد قائم ہُوا تھا اُسے پارہ پارہ کر دیا جائے۔ انہوں نے جو قوت حاصل کی تھی اُسے کمزور کر دیا جائے۔ بنگالی کو غیر بنگالی کے خلاف، سندھی کو غیر سندھی کے خلاف لڑایا جائے۔ ایک صوبے کو دوسرے صُوبے کے خلاف، ایک علاقے کو دوسرے علاقے کے خلاف دُشمن بنایا جائے۔ کبھی زبان کے مسئلے پر، کبھی ملازمتوں کے مسئلے پر اور کبھی قوم پرستی کے نام پر اور کبھی علاقائی عصبیت کے نام پر۔ کبھی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی افواہیں پھیلائی گئیں۔ کبھی خانہ جنگی کا ہوّا کھڑا کیا گیا۔ عوامی لیگ اپنے طبقاتی کردار کے اعتبار سے نہ "آزاد بنگلہ دیش" کی متحمل ہو سکتی ہے اور نہ خانہ جنگی کی۔ دونوں صورتوں میں قیادت اس کے ہاتھ سے نکل کر عوامی قوتوں کے ہاتھ میں آ جائے گی اور اس سے وہ ڈرتی ہے

عوامی لیگ اپنی تحریک جس طرح چلا رہی ہے وہ سرد جنگ کی حکمتِ عملی ہے۔ یہ سیاسی سودے بازی ہے۔ ڈھاکہ میں اس کے مشیر نوکر شاہی کے منجھے ہُوئے کارندے ہیں۔ امریکی کونسل جنرل بلڈ ہیں اور وہ دانشور ہیں جن کی تربیت تھوک کے حساب سے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں ہُوئی، اور کراچی میں اس کے مشیر ہارون برادران ہیں۔ جو اندرونِ خانہ حالات جانتے ہیں۔ جو اُسے باخبر رکھتے ہیں۔ اپنے اخبارات کے ذریعے اس کی حمایت میں فضا سازگار کر رہے ہیں جو مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کی سرد جنگ لڑ رہے ہیں اور اس لئے لڑ رہے ہیں کہ سیاسی اقتدار میں اُن کا حصّہ ہو۔ کہ پیداواری قوتوں پر ان کے طبقے کا قبضہ برقرار رہے۔ عوام کا استحصال جاری رہے اور اس معاشی استحصال میں مشرقی پاکستان کے اُبھرتے ہوتے سرمایہ دار اور نوکر شاہی ایک اہم حصّہ دار کی حیثیت سے شریک ہوں۔ سیاست کا مرغ باد نما اب اُسی سمت ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے جو سیاسی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے اس کا انجام یہی نظر آتا ہے۔ کیا مشرقی پاکستان کے عوام اور مغربی پاکستان کے عوام اس صورتِ حالات کو قبول کر لیں گے؟ اس کا جواب آنے والا وقت دے گا۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ شرمناک کردار ترمیم پسندوں کا ہے جو خود کو سوشلسٹ کہتے ہیں۔ عوام دوست کہتے ہیں اور اپنے عمل کے اعتبار سے استحصالی قوتوں کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ آج دولتانہ، مودودی، ہارون شبیر علی اور نصراللہ خاں کی آواز میں ترمیم پسندوں کی آواز بھی شامل ہے۔ سب کی ایک ہی تال ہے۔ ایک ہی سُر ہے۔ اور وہ ہے پیپلز پارٹی کی مخالفت ـ بھٹو کی مخالفت ـ کیوں؟ اس لئے کہ امریکی سامراج، روسی سوشل سامراج اور پاکستان کے استحصالی طبقات کے گٹھ جوڑ سے عوامی جمہوریہ چین کے خلاف فوجی حصار قائم کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان کو کمزور بنا کر بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ تاریخ اس سازش کے مجرموں کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔

ہے۔ یہ فسطائیت کا راستہ ہے۔ اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوامی لیگ بنگالی قوم پرستی کے کس رُخ کی نمائندگی کرتی ہے؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ اس کی جد و جہد کا رُخ کس کی طرف ہے؟ اس کے دُشمن کون ہیں۔ اس کے دوست کون ہیں؟ عوام کے دُشمن ہیں۔ جاگیردار، اجارہ دار سرمایہ دار، نوکر شاہی، عہدِ وسطیٰ کے باقیات یعنی ملائیت اور بیرونی سامراج۔ عوام کے دوست ہیں مزدور، کسان، طالب علم، باشعور دانشور، چھوٹے تاجر اور وہ تمام طبقات جو استحصال کا شکار ہیں۔

عوامی لیگ کہتی ہے کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کا استحصال کیا ہے ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے عوام کا استحصال ہُوا ہے۔ مگر یہ استحصال کس نے کیا ہے۔ وہ مغربی پاکستان کے عوام نہ تھے، عوام کے دوست نہ تھے، وہ جاگیردار تھے، سرمایہ دار تھے، نوکر شاہی تھی اور ان کی مددگار ملائیت تھی۔ مغربی پاکستان کے یہی استحصالی طبقات، یہی عوام دُشمن قوتیں آج عوامی لیگ کی ہمنوا ہیں۔ اس کی معاون و مددگار ہیں۔ ان کے مختلف چہرے ہیں۔ ان کے مختلف نام ہیں۔ ان میں دولتانہ ہیں، نور خان ہیں، اصغر خان ہیں، نواب زادہ نصراللہ خان ہیں، نواب زادہ شبیر علی خان ہیں، ہارون ہیں، قارون ہیں، مودودی ہیں، تھانوی ہیں۔ یہ وہ تمام قوتیں ہیں جنھیں انتخابات میں عوام نے مسترد کر دیا۔ اب یہی پٹے ہُوئے مُہرے جو سیاسی موت مر چکے تھے، قبروں سے منہ نکال رہے ہیں۔ کفن پھاڑ کر چیخ رہے ہیں۔ بیانات جاری کر رہے ہیں۔ پریس کانفرنسیں کر رہے ہیں۔ تقریریں کر رہے ہیں۔ نعرے لگا رہے ہیں۔ کس کی حمایت میں؟ کس کی مخالفت میں؟ عوامی لیگ کی حمایت میں اور پیپلز پارٹی کی مخالفت میں۔ یہ عوام کے مسترد سیاست دان عوام کے دوست کب سے بن گئے۔ کیا اُن کا طبقاتی کردار بدل گیا ہے؟ ہرگز نہیں! انسان کو اس کے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اور سیاسی جماعتوں کو اس کے اتحادیوں سے پہچانا جاتا ہے۔

آخری تجزیہ میں یہ حقیقت کھُل کر سامنے آ جاتی ہے کہ عوامی لیگ اپنا عوامی کردار ادا نہیں کر رہی ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام کے استحصال کے نام پر اُس نے جس جد و جہد کا آغاز کیا تھا وہ مغربی پاکستان کے استحصالی طبقات کی سازشوں کا شکار ہو گئی۔ ان حالات میں اگر عوامی لیگ کی فتح ہوئی تو یہ مشرقی پاکستان کے عوام کی فتح نہ ہوگی۔ مغربی پاکستان کے جاگیرداروں، سرمایہ داروں، نوکر شاہی اور ملائیت کی فتح ہوگی۔ شیخ مجیب الرحمٰن اگر مشرقی پاکستان کے عوام کی فتح چاہتے تو عوام سے عوام کی زبان میں بات کرتے۔ مشرقی پاکستان کے عوام سے مغربی پاکستان کے عوام کا رشتہ مضبوط کرتے۔ ڈھاکہ کی خلوت گاہ سے نکل کر مغربی پاکستان آتے۔ عوام کو اپنا نقطۂ نظر بتاتے۔ صورتِ حالات سے باخبر کرتے۔ ان کی ہمدردیاں حاصل کرتے۔ ملک کے دونوں بازوؤں میں اُبھرتی ہوئی عوامی قوتوں کو مستحکم بناتے اور اس مستحکم عوامی قوّت کے ساتھ استحصالی قوتوں کے خلاف جد و جہد کرتے۔ لیکن شیخ مجیب الرحمٰن کو عوام پر اعتماد نہیں، نہ مشرقی پاکستان کے عوام پر، نہ مغربی پاکستان کے عوام پر۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے عوام کے بجائے جاگیرداروں، بڑے سرمایہ داروں اور نوکر شاہی پر اعتماد کیا۔ یہ حقیقت ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کیا کم ہے کہ ایک بار پھر اس ملک کی قسمت کا فیصلہ ہارون برادران کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ ایوب خان نے بھی اپنے زوال کے وقت امریکی دباؤ کے تحت ہارون برادران کی بالا دستی تسلیم کر لی تھی۔ لیکن اس وقت بھی عوام نے اس



"اور اب بالآخر ۲۳ سال کے بعد ملک کے دونوں حصوں کو مطلق الاختیاری دیکر کنفیڈریشن کے رشتے میں پرو دیا جا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دو خود مختار حصے ہوں گے مغربی پاکستان چار صوبوں پر مشتمل ایک فیڈریشن ہوگی مغربی پاکستان ایک سوشلسٹ جمہوریہ کہلائیگا۔ چاروں صوبے ویسے خود مختار ہوں گے لیکن دفاع، خارجہ امور، غیر ملکی تجارت اور غیر ملکی اختیارات کے سلسلے میں اختیارات فیڈریشن کے پاس ہوں گے۔ مسلح افواج کا کیا ہوگا؟ یہ کچھ معلوم نہیں ہے۔"

کنفیڈریشن قائم ہو رہی ہے

محمود شام

خطرے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔

سازشیں ہو رہی ہیں۔

امریکہ روس اور بھارت اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔

مجیب صاحب کے چار مطالبات کے بعد مغربی پاکستان کے شکست خوردہ لیڈروں نے ان مطالبات کو وقت کی آواز قرار دیا ہے۔ پیپلز پارٹی نے بھی ان مطالبات کی حمایت سے انکار نہیں کیا" بلکہ بھٹو صاحب نے کراچی کے جلسہ عام میں یہ کہا کہ اگر آئین بننے سے پہلے اقتدار منتقل ہوتا ہے۔ تو مشرقی پاکستان میں وہاں کی اکثریتی پارٹی کو مغربی پاکستان میں یہاں کی اکثریتی پارٹی کو منتقل کیا جائے۔ اس تجویز پر رجعت پرست پھر بھڑک اٹھے ہیں۔ کہ اس طرح دو پاکستان بن جائیں گے۔ بھٹو صاحب پاکستان کے دو ٹکڑے کر رہے ہیں۔ چند دوسرے لیڈروں نے کہا ہے کہ بھٹو کو صرف سندھ اور پنجاب میں اکثریت حاصل ہے۔ وہ مغربی پاکستان کی نمائندگی کیسے کر سکتے ہیں۔ اسی منطق پر اگر یہ پوچھا جائے کہ عوامی لیگ کو صرف ایک صوبے یعنی مشرقی پاکستان میں اکثریت حاصل ہے، وہ پورے پاکستان کی نمائندگی کیسے کر سکتے ہیں۔ اگر ایک فرد ایک ووٹ کی حساب سے ہی دیکھتا ہے، اور اس طرح شیخ مجیب الرحمٰن پورے پاکستان کے نمائندے بن سکتے ہیں۔ تو اسی ایک فرد ایک ووٹ کے معیار پر ملک کے اس حصے میں ۱۴۴ سیٹوں میں سے ۸۹ سیٹیں حاصل کرنے والی جماعت مغربی پاکستان کی نمائندہ کیوں نہیں بن سکتی۔ اس لئے یہ دلیل تو قطعی طور پر بے بنیاد ہے کہ صرف سندھ اور پنجاب میں اکثریت حاصل ہونے کی بنا پر مسٹر بھٹو مغربی پاکستان کے نمائندہ نہیں بن سکتے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ شیخ مجیب اپنی شرائط پوری ہونے سے پہلے اسمبلی میں جانے کے سلسلے میں غور کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔ اس لئے امکان یہ ہے کہ اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے۔ یہ اقتدار کی منتقلی عارضی نوعیت کی ہوگی۔ کیونکہ کسی آئین کے بغیر ہو رہی ہے۔ اس لئے مارشل لا برقرار رہے گا شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے مغربی پاکستانی حامی مرکز میں اقتدار کی منتقلی چاہتے ہیں۔ جبکہ ممکن العمل یہ ہے کہ صوبوں میں عبوری حکومتیں قائم کر دی جائیں۔ اکثریتی پارٹیوں کے تعاون سے تاکہ ملک میں بڑھتی ہوئی اقتصادی بے چینی اور عوامی اضطراب کو دور کیا جا سکے۔ اور یہی ہونے والا بھی ہے۔ کیونکہ کسی آئینی ضمانت کے بغیر مرکز میں شیخ مجیب الرحمٰن کے حوالے اقتدار کرنے کا مقصد مغربی پاکستان میں شدید اضطراب پھیلانا ہوگا۔ شیخ مجیب چھ نکات کی بنیاد پر کامیاب ہوئے ہیں اور ان کی اکثریت تمام کی تمام مشرقی پاکستان سے ہے مغربی پاکستان میں چھ نکات کے خلاف شدید نفرت ہے۔ اس لئے کسی آئین کے بغیر شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت کو مغربی پاکستان کے عوام کی اکثریت اپنی حق تلفی سمجھے گی۔ کیونکہ انہوں نے چھ نکات کو قبول نہیں کیا اور چھ نکات والے امیدواروں کو انہوں نے مسترد کر دیا تھا اور ضمانتیں ضبط کروا دی تھیں۔

اقتدار کی یہ منتقلی بالکل ہی ایک عارضی اور عبوری نوعیت کی ہے، اس ملک کا آئین بہرحال بننا ہے۔ اور آئین بھی قابل عمل، اس ملک کو ایک رہنا ہے۔ اس کے لئے چند سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ جن کا جواب ہمارے ان رہنماؤں کو دینا ہے جو اس وقت شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار سپرد کر دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن چھ نکات میں تبدیلی یا سمجھوتہ کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے بقول چھ نکات عوام کی ملکیت ہیں۔ چھ نکات مغربی پاکستان کے لئے ناقابل قبول ہیں۔ قانونی طور پر وہ اپنی اکثریت سے چھ نکاتی آئین بنالیں گے۔ اس کے بعد دو صورتیں سامنے آئیں گی۔

۱۔ اگر صدر یحییٰ اس آئین کی منظوری دے دیں، تو پاکستان پانچ خود مختار ریاستوں میں بٹ جاتا ہے۔ اور مغربی پاکستان میں شدید ہنگامے رونما ہوتے ہیں مغربی پاکستان اس آئین کو قبول نہیں کرتا۔

۲۔ اگر صدر یحییٰ اس آئین کو رد کر دیتے ہیں تو اسمبلی ختم ہو جاتی ہے۔ الیکشن کے نتائج کالعدم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف مشرقی پاکستان بلکہ مغربی پاکستان میں بھی شدید ردعمل پیدا ہوتا ہے۔

اس کے بعد مسئلے کا کیا حل ہے۔ ایک حل تو یہ ہے کہ دونوں حصوں کے لئے الگ الگ آئین بنیں۔ شیخ صاحب کا یہ بیان محفوظ ہے کہ اگر مغربی پاکستان کے نمائندے چھ نکاتی آئین کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے ہیں تو وہ اپنے لئے اپنا آئین بنالیں۔ ان کے ساتھی عطاء الرحمٰن پچھلے سال دو آئین کی تجویز پیش کر چکے ہیں۔ بھٹو صاحب کی حالیہ تقریر سے بعض لوگ یہی تاثر لے رہے ہیں۔ (حالانکہ ایسا نہیں ہے) بھٹو صاحب کی یہ تجویز اس وقت تک کیلئے ہے جب تک آئین نہیں بن جاتا۔ کیونکہ بھٹو صاحب پہلے شیخ صاحب کی اس

ہم سب ایک ہیں











دوآئین والی تجویز پر اپنے تاثر کا اظہار اس صورت میں کر چکے ہیں کہ اس طرح میں نہیں جانتا کہ "آئینی تقدیس" کیسے باقی رہے گی۔

یہ بھی سنا جا رہا ہے کہ حالیہ مجیب یحییٰ ملاقات میں یہ بات زیر غور آئے گی۔ مشرقی پاکستان کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر سیاسی حلقے یہ امکان ظاہر کر رہے ہیں کہ اس بات کو ہی کسی صورت میں عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ کیونکہ چھ نکات پر کسی سمجھوتے کی امید باقی نہیں رہی۔ اس سے پہلے ایسوسی ایٹیڈ پریس آف امریکہ کے نمائندے نے بھی ایک خبر دی تھی کہ پاکستان میں دو وزیر اعظم ہوں گے۔ اور اس نمائندے سے میری بات ہوئی تو انہوں نے اس خبر کی صداقت پر اصرار کیا تھا۔ لیکن پیپلز پارٹی کے ترجمان اس خبر کی بھی تردید کر چکے ہیں۔

موجودہ صورت حال میں غیر ملکی امداد اور غیر ملکی تجارت کا نکتہ باقی رہ گیا ہے۔ اس پر شیخ صاحب سے بات ہوئی ہے۔ اس وقت مشرقی پاکستان میں صورت حال معمول پر آتی جا رہی ہے۔ مجیب صاحب بھی صدر کے خیر مقدم کا کہہ چکے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ صدر صاحب کے ساتھ محمود ہارون کی تیاریاں بھی ہوئیں۔ شیخ صاحب ہارون خاندان کا کہا بہت مانتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس خاندان کے ہاں ملازمت کر چکے ہیں۔ یوسف ہارون جب اپنی جلاوطنی سے لوٹے تھے تو انھوں نے سیدھے جا کر شیخ صاحب کے گاؤں میں ان سے ملاقات کی تھی۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جب پہلے صدر کا ڈھاکہ جانے کا پروگرام بنا تھا۔ اس وقت بھی محمود ہارون صاحب سے تیار رہنے کے لئے کہا گیا تھا۔ ہارون خاندان کے موجودہ کردار سے سب محب وطن افراد واقف ہیں۔ اور مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی سے ان کی مخاصمت بھی جانتے ہیں۔ ایسے حالات میں ان کو ساتھ لے کر جانے سے مغربی پاکستان میں بے شمار بدگمانیاں پیدا ہونے کا امکان ہے

صاحب ایسے سفر اکیلے ہی کریں تو اچھا ہے۔ دو آئین کی تجویز کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ اس وقت مشرقی پاکستان عملی طور پر مغربی پاکستان سے بالکل کٹ چکا ہے۔ وہاں صرف ہماری مسلح افواج کی موجودگی ایک پاکستان کا احساس دلاتی ہے۔ ورنہ وہاں سوائے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے دفتر کے کہیں پاکستانی پرچم نظر نہیں آتا۔ تمام عمارتوں سے یہ پرچم اتار دیئے گئے ہیں۔ اقتصادی رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ فوج نے سختی نہیں برتی۔ اپنا عمل دخل صرف چھاؤنیوں تک رکھا ہے۔ غیر بنگالیوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔

ڈھاکہ ائیرپورٹ پر کئی ہزار مغربی پاکستانی یکم مارچ سے پڑے ہیں۔ اور جہاز میں سیٹیں ملتے ہی وہاں سے بھاگتے ہیں۔ کئی جگہ غیر بنگالی افراد کو ہلاک بھی کیا

سوشلسٹ معیشت رائج

ہوئی تو دونوں حصوں کے عوام

اجنبی نہ رہیں گے

جا چکا ہے۔ اور علیحدگی کیا ہو سکتی ہے۔ مغربی پاکستان کے "قومی رہنماؤں" کو یا مشرقی پاکستان کے لیڈروں کو پاکستانی پرچم کی توہین کا کوئی افسوس نہیں ہوا۔ اصغر خان جو اس وقت بہت بڑے "محب وطن" بننے کا دعویٰ کر رہے ہیں انہوں نے بھی اس بات پر کوئی احتجاج نہ کیا۔ حالانکہ انہوں نے ملازمت اختیار کرتے وقت اس جھنڈے سے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب نے انتہا پسندوں کے دباؤ کے باوجود آزادی کا اعلان نہیں کیا۔ حالانکہ وہاں بنگلہ دیش

کا پرچم بھی تیار ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب اپنے منہ سے کبھی آزادی کا اعلان نہیں کریں گے۔ کیونکہ امریکی حکمت عملی یہی ہے۔ جس روز شیخ صاحب نے آزادی کا اعلان کیا اسی روز مشرقی پاکستان میں شیخ صاحب کی گرفت کمزور پڑ جائے گی۔ مشرقی پاکستان کے مزدوروں کسانوں کے انقلابی کارکن سامنے آ جائیں گے اور عوامی انقلاب کے لئے جدوجہد تیز کر دیں گے۔ جو پہلے ہی مشرقی پاکستان کے بیشتر علاقوں میں بہت زوروں پر ہے۔ پبنہ، کھلنا، چٹاگانگ، راجشاہی اور کئی دوسرے علاقوں میں ان انقلابی کارکنوں کا عوامی لیگ سے زیادہ اثر ہے۔ مجیب صاحب ان سے بہت خوفزدہ ہیں۔ "آزادی" کے بعد دوسری عوام دوست طاقتیں مجیب کی امریکہ نواز پالیسیوں کے مقابلے میں عوامی انقلابی کارکنوں کی حمایت کریں گی۔

حقیقت حال یہ نہیں ہے کہ شیخ صاحب انتہا پسندوں کے دباؤ کے باوجود آزادی کا اعلان نہیں کیا۔ اس وقت پاکستان کی سالمیت کا سہرا شیخ صاحب کے سر ہے۔ یہ عجیب منطق ہے کہ عملی طور پر اس حصے کو علیحدہ بھی کر دیا گیا ہے۔ پھر ملک کی سالمیت کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ علیحدگی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اس مہم میں عدلیہ تک ملوث ہو گئی۔ جس ترتیب سے یہ تمام واقعات ہوتے ہیں ان سے احساس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے اور پہلے سے تیار کردہ منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔ دراصل یہ ساری تیاریاں اس وقت کے لئے کی گئی تھیں جب ۱۲۰ دن کی مدت ختم ہونے اور مشرقی پاکستان کی طرف سے چھ نکاتی آئین پیش کرنے کے بعد صدر یحییٰ چھ نکاتی آئین کو مسترد

کر دیں تو اس کے خلاف مشرقی پاکستان میں فوری طور پر کیسے احتجاج کرنا ہے اور مغربی پاکستان کے رہنماؤں کا کس طرح گھیراؤ کرنا ہے۔ پی آئی اے وغیرہ میں بھی ہڑتال کروا کر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا رابطہ منقطع کر دینا ہے۔ مغربی پاکستان کے چھ نکات کی مخالفت کرنے والے نمائندے بھی مشرقی پاکستان میں گھر کر رہ جائیں گے۔ مگر اب صورت حال مختلف ہو گئی۔ اور شیخ صاحب کو یہ سب کچھ ابھی کر دینا پڑا ہے۔

ان چھپے ہوئے بحرانوں کے سامنے آنے کے بعد سب امکانات بھی کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کس حد تک ساتھ رہنا چاہتا ہے اور مغربی پاکستان والے مشرقی پاکستان والوں کو کس حد تک متفق کر سکتے ہیں۔ سیاسی مصالحت کی کوششیں بھی ہو چکیں۔ اور فوج بھی بھجوا کر دیکھ لی۔ شیخ صاحب پہلے ہی کہہ چکے ہیں ہم بھائیوں کی طرح اکٹھے رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ مغربی پاکستان والے بھی دیکھ چکے ہیں کہ مشرقی پاکستان چھ نکات سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔ مشرقی پاکستان والے بھی سمجھ چکے کہ مغربی پاکستان والے چھ نکات کے حق میں نہیں ہیں اور انہیں چھ نکات قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی جماعتوں کے بعد دونوں صوبوں کو متحد رکھنے والی دوسری طاقت مسلح افواج تھیں۔ لیکن وہ بھی بوجوہ فضا کو ہموار نہ کر سکیں۔

اور اب بالآخر ۲۳ سال بعد ملک کے دونوں حصوں کو مطلق الاختیاری دے کر کنفیڈریشن کے رشتے میں پرو ڈالا جا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دو خود مختار حصے ہوں گے۔ مغربی پاکستان چار صوبوں پر مشتمل ایک فیڈریشن ہوگی۔ مغربی پاکستان ایک سوشلسٹ جمہوریہ کہلائے گا۔ چاروں صوبے

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

چھوٹی جیل — بڑی جیل

(میر علی احمد تالپور سے معذرت کے بغیر)

ابراہیم جلیس

پاکستان میں جب پہلی بار مجھے جیل ہوئی تھی اُن دنوں میں میاں افتخارالدین مرحوم کے اخبار "امروز" میں بحیثیت سب ایڈیٹر ملازم تھا۔ میری تنخواہ صرف دو سو دس روپے ماہوار تھی یعنی صرف سات روپے روز۔

اس کے بعد جب غریب عوام کی حمایت میں صرف ایک مضمون لکھنے کے جرم میں مجھے جیل میں ٹھونسا گیا تو ابتدائی پندرہ دن سی کلاس میں سزا دینے کے بعد اے کلاس میں منتقل کرتے ہوئے مجھے "خوش خبری" سنائی گئی کہ

"آج سے تمہیں روزانہ ۱۱ روپے الاؤنس ملے گا"

تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔

۱۱ روپے روز یعنی ۳۳۰ روپے ماہوار!!

واہ کیسا مذاق ہے یہ۔!

"بڑی جیل کے قیدی کی حیثیت سے صرف ۲۱۰ روپے ماہوار۔ اور "چھوٹی جیل" کے قیدی کی حیثیت سے ۳۳۰ روپے ماہوار!!

پھر مجھے بڑا افسوس بھی ہوا کہ شروع ہی سے مجھے جیل کیوں نہ ہوئی۔

ماہوار آمدنی میں اس اچانک اضافے کے باعث "چھوٹی جیل" میں زندگی کے دن بڑے مزے سے گذر رہے تھے کہ ایک دن حکم آیا کہ مجھے شہر کراچی کے حاکم اعلیٰ سید ہاشم رضا نے طلب فرمایا ہے۔ میں ہتھکڑی کے زیور سے آراستہ سید ہاشم رضا کے سامنے پیش کیا گیا تو انہیں بڑا غصہ آیا اور انہوں نے ان جاہل سپاہیوں کو بڑا ڈانٹا کہ انہوں نے ایک تعلیم یافتہ انسان کو ہتھکڑی لگائی ہے ہاشم رضا صاحب نے ہتھکڑی کے لئے معذرت کی اور بڑی شفقت کے ساتھ کرسی پر بیٹھنے کو کہا، اور پھر یہ "بدخبری" سنائی

"میں آپ کو رہا کر رہا ہوں"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیوں۔! آپ مجھے کیوں رہا کر رہے ہیں۔؟ میرا کوئی قصور۔؟؟

ہاشم رضا صاحب نے بڑے حیران ہوئے انہوں نے شاید یہ سمجھا کہ میں نے اُلٹ سُنا ہے۔ میں اونچا سنتا ہوں، اس لئے انہوں نے بہ آواز بلند کہا۔

"آپ سمجھے نہیں۔ میں آپ کو آج قید سے رہا کر رہا ہوں"

میں نے عرض کیا۔

"جی میں نے سُن لیا ہے لیکن میں تو اب رہا نہیں ہونا چاہتا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ؎

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اس جیل میں تو میری تنخواہ بھی معقول ہے۔ چھوٹی جیل سے نکل کر بڑی جیل میں جاؤں گا تو ماہوار آمدنی بھی گھٹ جائے گی اور رہنے کھانے پینے کی بھی نئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

سید ہاشم رضا بہت ہنسے اور بولے۔

"بھئی۔ فی الحال تو میں تمہیں رہا کرنے پر مجبور ہوں۔ لیکن

"تم زندہ —— جیل باقی"

"ہمت نہ ہارو آگے بہت سے مواقع ہیں"

اس ڈھارس نے ہمت بندھائی اور بادل نخواستہ چھوٹی جیل سے چھوٹ کر "بڑی جیل" میں اپنے ایک دوست کے گھر پہنچا۔

گھر میں جیل کا سا وہ آرام تو نہیں ملا جو گھر کا سا آرام جیل میں ملا تھا۔

یہ واقعہ آج میں نے اس لئے بیان کیا ہے کہ میں نے ابھی ابھی اخباروں میں مادرِ سندھ کے دو نہایت پیارے فرزندوں میر علی احمد تالپور اور میر رسول بخش تالپور میں سے بڑے میر یعنی علی احمد تالپور کا ایک بیان پڑھا ہے جس کے ذریعے انہوں نے گورنر سندھ سے مطالبہ کیا ہے کہ:

"ہائی کورٹ کے کسی جج کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جائے اور اس کمیٹی کے ارکان وہ سیاسی رہنما بھی ہوں جو اُن جیلوں میں خود رہ چکے ہیں"

اس مطالبے کے بعد میر علی احمد تالپور نے پسِ دیوارِ زنداں اپنے مشاہدات اور تجربات یوں بیان کئے ہیں کہ:

"پاکستانی جیلیں بالخصوص سندھ کی جیلیں نازی جنگی قیدیوں کے کیمپوں سے بھی بدتر ہیں۔ اکثر قیدیوں کو جانوروں سے بھی بدتر کھانا دیا جاتا ہے، اور اکثر قیدی دق یا ایسے ہی مہلک امراض میں بے علاج و بے تیمارداری جاں بہ لب ہیں وغیرہ وغیرہ"

(ہمارا خیال ہے کہ میر صاحب نے یہاں جیل سے باہر رہنے والے اُن عوام کا تذکرہ شاید مصلحتاً نہیں کیا جنھیں جیل میں روکھی سوکھی روٹی اور ملاوٹ والی دوائیں تو مل جاتی ہیں لیکن باہر تو وہ بھی نہیں ملتیں۔)

میر علی احمد تالپور اور میر رسول بخش تالپور سندھ کے میروں کے اس معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس نے سندھ پر پچاس برس حکومت کی۔ بقول شخصے:

"جو مقام تاریخ ہند میں علی برادران کا
وہی مقام تاریخ سندھ میں میر برادران کا۔"

میر علی احمد تالپور تو پاکستان بننے کے بعد ایک بار وزیر بننے کی غلطی کا ارتکاب بھی کر چکے ہیں اور اب پاکستان میں ایک نئی روایت کا آغاز ہو چکا ہے کہ:

"جو تخت پہ وہ بالآخر تختے پر"

چنانچہ میر علی احمد بھی جو کوئے یار سے نکلے تو سُوئے دار چلے۔ یعنی جس سندھ پر انھوں نے حکومت کی۔ اسی سندھ کی ایک جیل کی کال کوٹھڑی میں ننگے فرش پر ایسا کمبل اوڑھ کر بھی سوئے۔ جس کمبل میں "روئیں کم اور جوئیں زیادہ"

میر علی احمد میر ہونے کے باوجود سندھی بلکہ غریب اور مخلص سارے پاکستانی عوام کا "بڑا سچا نمونہ" ہیں

اگر کوئی غیر ملکی شخص جس نے پہلے کبھی نہ سندھ دیکھا ہو اور سندھی عوام۔ اگر وہ صرف میر علی احمد تالپور یا میر رسول بخش تالپور سے مل لے تو پھر اس کا وہی حال ہو جو حال عمر کا ماروی کو دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔

میر علی احمد تالپور نے سندھ کی جیلوں میں اصلاح کے لئے جو مطالبہ کیا ہے ہمیں اس سے لفظ بہ لفظ بلکہ حرف بہ حرف اتفاق ہے۔ ہماری طرف سے بھی اس مطالبے کے نیچے ایضاً۔

ہم بھی جیل سے نکلے تھے تو ہم نے بھی "جیل کے دن جیل کی راتیں" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں بالتفصیل یہ بتایا گیا تھا کہ جیل تو پرانے اور عادی مجرموں کے لئے ایک آرام گاہ یا ہیلتھ ریزارٹ ہے اور نئے مجرموں کے لئے ایک بڑی معیاری تربیت گاہ یا ٹریننگ کالج ہے۔

ہم نے لکھا تھا کہ حکومت نے یہ جیلیں اخلاقی مجرموں کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ اپنے سیاسی مخالفین کو سزا دینے کے لئے قائم کی ہیں۔ اخلاقی مجرم تو حکومت نے شاید یوں ہی اخلاقاً بند کر رکھے ہیں۔ جس طرح ریلوے کے فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے کے ساتھ نوکروں کو بھی سفر کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ یا پھر۔ دنیا کے عیّاش ارب پتی ارسٹوٹل اوناسس نے صرف جیکولین کینیڈی کو چاہا اور اُس کے ساتھ اس کے سابق شوہر جان کینیڈی کے بچے بھی چلے آئے۔ جس طرح اوناسس کو جیکولین کے پہلے شوہر کے بچّوں سے دلچسپی نہیں، صرف جیکولین سے عشق ہے اسی طرح پاکستان کی حکومتوں کو بھی اصل جرائم پیشہ اور اخلاقی قیدیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انھیں تو صرف اپنے سیاسی مخالفین سے "عشق" ہے

ہمارے علاوہ حضرت فیض احمد فیض نے "زنداں نامہ" اور حمید اختر نے "کال کوٹھڑی"

لکھی۔ سید سبط حسن، محمد حسن عطاء، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ ملک، حسن عابدی، حبیب جالب، میجر اسحٰق، کیپٹن ظفراللہ پوشنی، معراج محمد خاں، منہاج برنا، طارق عزیز، اور بیسیوں ترقی پسند رہنماؤں اور دانشوروں نے اپنی اپنی جیل یاترا کے کم و بیش وہی واقعات بتاتے ہیں جو میر علی احمد تالپور نے بتائے ہیں۔

اپنے ذاتی تجربے اور یارانِ قفس کے مشاہدات کے مطالعے کے بعد ہم بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب تک پاکستان سرمایہ دارانہ نظام کے شکنجے میں جکڑا رہے گا۔ پاکستان بھی اپنے عوام کے لئے ایک "بڑی جیل" ہی رہے گا۔ جبھی تو شاعرِ عوام حبیب جالب نے کہا تھا ؂

چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالب نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے کوئی زنداں تو نہیں تھا

لیکن ــــ جیسے ہی پاکستان میں ایک اشتراکی معاشرہ قائم ہوگا پاکستان بھی مسلم عوام کے لئے ایک ارضی جنت بن جائیگا۔ پھر اس کے بعد "چھوٹی جیل" کی چار دیواری سارے پاکستان میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔

سوشلسٹ نظام میں جب ہر شخص کو روٹی کپڑا، مکان، دوا، کتاب، تفریح اور آرام میسر آئے گا تو اُسے کسی باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب کرے۔

جب تک ملک کا سارا اقتصادی نظام قومی دولت کی عادلانہ تقسیم کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتا صرف ایک جیل کی اصلاح سے کیا ہوگا۔ ایک جیل کی اصلاح کی مثال تو ایسی ہوگی جیسے ایک طوائف گناہ کی زندگی سے توبہ کرلے لیکن رہے پھر اسی "بازار گاہ" میں۔

ویسے یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ یہاں مغربی پاکستان میں تو میر علی احمد تالپور اور دیگر عوامی رہنما جیلوں میں اصلاح کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور وہاں مشرقی پاکستان میں قیدی شہر شہر جیل پر جیل توڑتے جا رہے ہیں۔

اب وہ دن زیادہ دور نہیں معلوم ہوتا جب دنیا میں انسان ہر قسم کی قید و بند سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے گا۔ اور روحِ اقبال جھوم اُٹھے گی کہ واہ! ؎

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دُنیا

طارق عزیز کی فلم میں
بارہ کروڑ ہیرو ہوں گے



ــــ نمائندہ الفتح ــــ

"جئے بھٹو" کے نام سے میں ایک فلم بناؤں گا جو تاریخ میں سنگ میل بن جائے گی۔" طارق عزیز نے یہ بات بڑے عزم کے ساتھ کہی تو میں نے ایک بار کسی قدر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بیان مجھے یاد آیا جب طارق عزیز نے جیل سے رہائی پاتے ہی اعلان کیا تھا کہ "طارق عزیز کا فن اب ایک مشن بن گیا ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا تھا کہ "میں سوشلزم پر مبنی فلمیں بناؤں گا۔" اس وقت بھی جب میرے ذہن میں ان باتوں کی بازگشت ہوئی تو میں نے یہ یاد دہانی کرائی کہ اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے آپ جو پہلی فلم بنا رہے ہیں وہ سوشلزم پر مبنی نہیں ہے بلکہ بھٹو صاحب کے نام سے منسوب ہے۔ پھر آپ کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ یہ ایک تاریخی فلم ہوگی لیکن اگر شخصیات نے اپنا راستہ بدل دیا تو شخصیات پر بننے والی اس فلم کی تاریخی حیثیت کتنی دیر برقرار رہے گی؟"

میرے اس سوال نے طارق عزیز کو قطعی طور پر پریشان نہیں کیا۔ انہوں نے کرسی پر اپنے دونوں پیر پھیلائے اور سگریٹ کی ڈبی کے آخری سگریٹ کو ٹھونک کر منہ میں لگاتے ہوئے ماتھے کی شکنوں میں کچھ اور اضافہ کیا پھر بڑے اطمینان سے اپنے ڈبہ ٹیک سنگھ والے لہجے میں بتایا:

"ہم جب بھٹو کا نام استعمال کرتے ہیں تو اسے علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ 'جئے بھٹو' بھٹو صاحب کی زندگی پر کوئی ڈاکومینٹری فلم ہوگی تو وہ ایسا سوچ کر میرے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ بھٹو میرے لئے سوشلزم کی ایک علامت ہے ظلم و تشدد اور استحصال کے خلاف جنگ کرنے والے مزدور کسان کی علامت ہے۔ میری فلم "جئے بھٹو" بھی انہیں مزدوروں، کسانوں اور مظلوم طبقوں کی کہانی ہے جن کے لئے بھٹو جدوجہد کر رہا ہے۔ جن کے لئے میں نے اپنا فن، اپنی توانائی بلکہ خود اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ جئے بھٹو کا ہیرو کوئی ایک شخص نہیں بلکہ بارہ کروڑ عوام ہیں۔ دھرتی اس کی ہیروئن ہے۔ اور سرمایہ دار، جاگیردار اور سامراج اس کے ولن ہیں۔"

طارق عزیز کے لہجے کی گھن گرج اور پختگی نے مجھے بڑی حد تک مطمئن کیا۔ پھر انہوں نے مزید بتایا کہ شخصیتوں نے اپنا راستہ تبدیل کیا تب بھی میری فلم کی تاریخی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ بھٹو صاحب نے اگر مزدور کسان کی راہ سے ہٹ کر کوئی اور راہ اپنائی تو یہ فلم ایک تاریخی دستاویز بن جائے گی۔ ماضی اور حال کے درمیانی فاصلے کے ہر موڑ کو اسکرین پر منتقل کر کے کل کے لوگوں کو یہ بتائے گی کہ لوگ راستے بھی بدل لیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ویسے یہ میرا یقین ہے کہ میرا بھٹو جو آج مزدور کسان کی علامت ہے اپنے راستے کبھی نہیں بدلے گا۔ میں بالکل مایوس نہیں ہوں۔ اس لئے بھی کہ بھٹو آج بھی برملا کہتا ہے کہ میرا ایک پاؤں اگر اسمبلی کے اندر ہے تو ایک پاؤں اسمبلی سے باہر ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو یہ فلم عبرت کا ایک مرقع بن جائے گی۔

طارق عزیز نے اپنی اس فلم کا اعلان لاہور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میری اس پریس کانفرنس کی بہت سی باتیں غلط سمجھی گئیں۔ لوگوں نے سمجھا کہ شاید طارق عزیز بھٹو کی زندگی پر کوئی دستاویزی فلم بنانے جا رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک کمرشیل فلم ہوگی جو ایک مکمل فیچر فلم کے تمام تقاضے پورے کرے گی اس میں پائل بھی چھنکے گی اور جسم بھی تھرکیں گے۔" اس میں آواز کا جادو بھی جاگے گا اور سُر تال کی باریکیاں بھی ملحوظ خاطر رہیں گی۔ اس میں محبتیں بھی ہوں گی اور رقابتیں بھی۔ اس میں ملک کے چوٹی کے فن کار ہوں گے۔ بہترین تکنیک کار اس کی نوک و پلک سنواریں گے۔ اس کو ٹیکنی کلر بنا کر ناظرین کی ذوقِ نگاہ کی تسکین کے سارے سامان فراہم کریں گے۔ لیکن پھر بھی یہ ایک نئی فلم ہوگی۔ اس میں جب بدن تھرکیں گے تو دیکھنے والوں کے دل و دماغ کو ایک نیا ولولہ دیں گے۔ اس میں موسیقی کا جادو جاگے گا تو لوگ سحر زدہ ہو کر سوئیں گے نہیں۔ بلکہ یہ تان انہیں نئے انقلابی جذبوں سے آشنا کرے گی۔ اس کی محبتیں بھی تمام محبتوں کی طرح نہیں ہیں اس کی محبتوں کا آئیڈیل عورت کے گرد نہیں گھومیں گے بلکہ بڑی محبت دھرتی کی محبت ہوگی۔ اور اسی کے واسطے سے دھرتی کے بیٹے بیٹیاں آپس میں محبت کریں گے۔

طارق عزیز سے جب میں نے ذرا کی لستی کو ملانے کے ان کے پرانے منصوبے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ "جئے بھٹو" سے ایک ادارے کی داغ بیل پڑ رہی ہے جس کے تحت وہ اپنے اس منصوبے کی تکمیل کریں گے جس کا اعلان انہوں نے جیل سے رہائی کے بعد کیا تھا۔ کہ وہ اب سوشلزم پر مبنی فلمیں بنائیں گے۔ جئے بھٹو کے بارے میں انہوں نے مزید بتایا کہ یہ بین الاقوامی معیار پر تیار کی جائے گی۔ یہ مکمل رنگین ہوگی اور اس میں چوٹی کے فن کار اپنی زندگی کا بہترین کردار ادا کریں گے۔

انہوں نے بتایا کہ اس فلم کے لئے لاہور میں بھٹو صاحب کے جلسے کی شوٹنگ کی جا چکی ہے۔ کہانی تیار ہے۔ شوٹنگ اسکرپٹ بھی عنقریب تیار ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں مختلف ماہرین اور چوٹی کے دانشوروں سے مشورے کئے گئے ہیں خصوصاً جناب احمد ندیم قاسمی اور ریاض شاہد سے اس سلسلے میں متعدد تجاویز حاصل کی گئی ہیں انہوں نے بتایا کہ اس فلم کیلئے میرا کیمرہ کراچی سے خیبر تک گھومے گا۔ اور ہر فلمانے والی چیز کو فلمائے گا انہوں نے کہا کہ اسی میں وہ شخصیتیں بھی نظر آئیں گی جنہیں دھرتی سے پیار ہے اور اپنے اس پیار پر جنہوں نے اپنا تن من دھن لٹا رکھا ہے۔



ظلم وتشدد کی کہانیا

وہ چوبیس دن
جب پولیس نے مجھ پر انسانیت سوز ظلم ڈھائے

پولیس کے تشدد سے معراج خاں کی والدہ بھی نہ بچ سکیں

وہاب صدیقی

۱۹۵۹ء کے اواخر کا ذکر ہے، مارشل لار کا دور تھا ایوبی آمریت مستحکم ہو چکی تھی۔ اخبارات اس کی قصیدہ گوئی میں مصروف تھے۔ بڑے بڑے جغادری عوامی رہنما اسے صلاح الدین ایوبی کا ثانی قرار دے رہے تھے۔ اجارہ دار سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے نمائندے ہونے کی وجہ سے ایوب خاں کے امریکی سامراج سے خصوصی تعلقات تھے۔ انھیں شمال سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس "خطرے" کے بہانے انہوں نے پشاور میں امریکی فوجی، اڈہ بنانے کی اجازت دے دی تھی۔ امریکی امداد اور پروپیگنڈہ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ ہر طرف "تھینک یو امریکہ" کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ عوام دوست طبقوں کو پابند و سلاسل کیا جا رہا تھا۔ اس پُر آشوب اور تاریک دور میں گھٹے ہوئے جسم، کشادہ سینے، مضبوط ہاتھ پاؤں اور روشن آنکھوں والا ایک نوجوان عوام دوستی کا دم بھر رہا تھا اور سامراج کا بدترین مخالف تھا۔ وہ اپنی شعلہ بار تقریروں میں ایوب آمریت اور سامراج کے مکروہ عزائم آشکار کرتا۔ وہ نوجوان اس تاریک دور میں عوام کے لئے روشنی کی کرن تھا اور اپنے دور کا دیوتا بھی۔ ع

اظہار کا جس کو حوصلہ ہے
وہ اپنی صدی کا دیوتا ہے
منصور سے کم نہیں ہے وہ بھی
جو اپنی زبان سے بولتا ہے

یہ نوجوان معراج محمد خاں تھا جو اس وقت این ایس ایف کے سرگرم کارکن اور ایس ایم آرٹس کالج کے یونٹ کے سیکرٹری تھے۔ معراج محمد خان اپنی عوام دوستی، سامراج اور نوکر شاہی دشمنی کی وجہ سے حکام اور پولیس کے لئے سب سے بڑا "خطرہ" تھے۔ پولیس اور سی آئی ڈی انھیں گرفتار کرنے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ اور موقع اسے مل گیا۔ وہ یوں کہ امریکی سامراج کا پاکستان میں اپنا اثر و رسوخ مزید بڑھانے کے لئے صدر امریکہ آئزن ہاور پاکستان آنے والے تھے۔ ایوب خاں اور سی آئی ڈی کو خدشہ تھا کہ مبادا پاکستان کے عوام دوست اور سامراج دشمن طبقے جاپانی عوام کی طرح امریکی صدر کے طیارے کو سرزمین پاک میں نہ اترنے دیں۔ چنانچہ اس اندیشے کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ تمام سامراج دشمن افراد کو گرفتار کر لیا جائے۔ ایسے افراد کی فہرست تیار ہوئی۔ معراج محمد خاں کا نام سرفہرست تھا۔

چنانچہ ایک شب معراج محمد خاں کانی ہاؤس میں چند دوستوں سے مصروف گفتگو تھے، سکیورٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتاری کے بعد انھیں تھانے کی بجائے گھر لے جایا گیا۔ راستہ بھر پولیس والے انھیں گالیوں سے نوازتے رہے۔ معراج کا کہنا ہے کہ سارے راستے میں سوچتا رہا کہ اتنا غیر مہذب برتاؤ تو عہد غلامی میں بھی سیاسی ملزموں سے نہیں کیا جاتا تھا۔ کجا آزادی کے بعد ہمارے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔ معراج کے گھر میں پولیس نے جو حرکتیں کیں وہ معراج ہی کی زبانی سنئے:۔

"دروازہ اندر سے بند تھا۔ پولیس نے دستک دی کھولنے میں ذرا دیر ہوئی تو دروازے پر ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ میری بوڑھی والدہ نے دروازہ کھولا، ابھی وہ پورا دروازہ بھی نہیں کھولنے پائی تھیں کہ ایک پولیس والے نے انھیں زور سے دھکا دیا۔ اور وہ زمین پر آ رہیں۔ میرا خون کھول گیا لیکن مجبور تھا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑی ہوئی تھی۔ پولیس ایک دم اندر داخل ہو گئی۔ فحش گالیاں بکتے ہوئے ایک ایک کونے کی تلاشی لی۔ بکسوں کو ٹھوکریں لگائیں ایک ایک کپڑا، ایک ایک کتاب اور ایک ایک چیز الٹ پلٹ کر دی۔ مجھے بڑے رہنماؤں کی تصاویر جمع کرنے کا شوق ہے۔ میرے کمرے میں قائد اعظم رح، اقبال رح، لینن، اسٹالن اور ماؤزے تنگ کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ پولیس نے تمام تصاویر اور کتابیں جمع کیں اور اپنی مرضی کے مطابق فہرست بنائی اور میرے دستخط بھی خود ہی کر لیے۔"

پھر معراج کو بغدادی کے تھانے لے جایا گیا، وہاں لاتوں، مکوں اور بیدوں سے ان کی تواضع کی گئی۔ معراج کا کہنا ہے کہ مارتے جاتے تھے اور کہتے تھے "اور دم بھرو عوام دوستی کا" دوسرے دن سنٹرل جیل بھیجدیا گیا۔

یہ تھا معراج محمد خاں کی پہلی گرفتاری کا قصہ، اس گرفتاری نے جہاں معراج کو سخت تکالیف دیں، وہاں تجربات بھی دیئے۔ ان کے شعور کو جلا ملی۔ سامراج سے نفرت اور بڑھی، عوام دوستی اور حب الوطنی کے جذبات اور ابھرے۔ ع

بڑھتا ووق جرم یہاں ہر سزا کے بعد

عوام دوستی اور حب الوطنی کے جذبات اندر ہی اندر پروان چڑھتے رہے۔ بالآخر وہ فروری ۱۹۶۱ء میں پھوٹ پڑے۔ جب فروری ۱۹۶۱ء میں لومبا قتل ہوئے۔ کانگو کی آزادی سلب کر لی گئی۔ اور جبل پور میں وسیع پیمانے پر مسلم کش فسادات ہوئے تو پاکستان کے سامراج دشمن طبقوں میں بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ اس زمانے میں ایوب آمریت فسطائیت کا روپ دھار چکی تھی۔ تین ماہ پیشتر مزدوروں اور کسانوں کی دل کی دھڑکن اور دوست حسن ناصر اس فسطائیت کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اس موقع پر طالب علم سامنے آئے۔ شیر افضل، جوہر حسین، فتح یاب علی خاں اور معراج محمد خاں کی قیادت میں کراچی کے طلبہ نے ظلم و استبداد، آمریت اور سامراج کے خلاف آواز اٹھائی۔ ایوب آمریت کے خلاف یہ پہلی جدوجہد تھی۔ ایوب آمریت کے قلعے پر پہلا پتھر پھینکنے والے معراج محمد خاں اور اس کے ساتھی ہی تھے۔ حکام کے لئے یہ غیر متوقع تھی۔ وہ پوری قوم کو اپنا غلام سمجھ بیٹھے تھے اور غلام اپنے آقا سے کس طرح بغاوت کر سکتا ہے یہ بات ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

۲۶ر فروری کو جبل پور کے مسلمانوں کے قتل عام کے سلسلے میں بھارت کے خلاف جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اجازت کے لئے درخواست دی۔ ۲۵ر فروری کو کمشنر کراچی نے معراج محمد خاں، فتح یاب علی خاں، ڈاکٹر شیر افضل اور جوہر حسین وغیرہ کو بلایا اور کہا "تم بھارت کے خلاف جلوس نکالنے والے کون ہوتے ہو۔ اگر حکومت کو احتجاج یا کوئی اور اقدام کرنا ہوگا تو وہ خود کرے گی۔ آپ لوگ خاموش رہیں۔ اور اگر جلوس نکالا تو تمھارا سر توڑ دیا جائے گا۔" لیکن طلبہ نے ۲۶ر فروری کو جلوس

نکالا۔ پولیس نے بُری طرح لاٹھی چارج کیا۔ ایس ایم کالج میں لڑکیوں کے کامن روم پر آنسو گیس کے بے شمار شیل گرائے۔ اور سینکڑوں طلبہ اور راہ چلتے عام شہریوں کو گرفتار کر لیا۔ معراج محمد خاں کی گرفتاری تقریباً ۲ بجے دوپہر کو عمل میں آئی۔

معراج محمد خاں، فتح یاب علی خاں، جوہر حسین اور شیر افضل کو آرٹلری میدان کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس حوالات میں کئی بے گناہ لوگ بھی تھے۔ پولیس ایسے لوگوں سے ہزار ہزار دو دو ہزار روپے لے کر چھوڑ رہی تھی۔ ایک ۷۵ سالہ باریش بوڑھے کو تقریباً دو ہزار روپے کے عوض رہائی ملی۔ طلبہ کو رات کا کھانا نہیں دیا گیا صرف ایک پرانا کمبل دیا گیا۔ جو انہوں نے زمین پر بچھا لیا۔ کوئی ڈیڑھ بجے شب کا عمل ہوگا کہ ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی حوالات میں داخل ہوئے۔ ایک سپاہی نے معراج کو ٹھوکر مار کر کہا "چلو تمھیں ایس پی صاحب بلاتا ہے۔" دوسرے سپاہی نے پیچھے سے معراج کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے۔ اور دھکے دے کر ایس پی حبیب الرحمٰن کے سامنے لے گئے۔ ایس ایچ او نے کارروائی دکھانے کے لئے یونہی چار پانچ تھپڑ جڑ دیئے۔ ایس پی نے فحش گالیاں دیتے ہوئے کہا کہ "پلستر چڑھاؤ اور اگر یہ نہیں بتائے کہ اسے روس اور چین سے کتنا روپیہ ملا ہے تو اسے جان سے مار ڈالو۔"

معراج نے بتایا کہ "ایس پی کا حکم سنتے ہی مجھے ایک الگ تھلگ بنے ہوئے تاریک کمرے میں لے گئے۔ کمرہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد ایس ایچ او اور دس سپاہیوں نے مل کر مکوں، لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ پھر زمین پر گرا کر پانچ چھ سپاہی ٹانگوں، بازوؤں اور گردن پر چڑھ گئے۔ کسی نے "آجا موسے بالما تیرا انتظار ہے" کہہ کر کوئی چیز میری کمر پہ زور سے ماری۔ چوٹ اتنی سخت تھی کہ میں بے حال ہو گیا۔ نیم بے ہوشی کا عالم طاری ہو گیا۔ اور جب دوسری پڑی تو بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ کمر خون سے تر تھی۔ میرے بعد فتح یاب علی خاں اور جوہر حسین کو پولیس نے تشدد کا نشانہ بنایا۔ دوسرے دن شام کو پھر ایس پی حبیب الرحمٰن کے حضور پیش کیا گیا۔ اس نے میری شکل دیکھتے ہی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ احتجاج کیا تو گالیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ کمر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کرسی پر بیٹھنے لگا تو ایس پی نے گالی دے کر کہا زمین پر بیٹھو، تم لوگوں نے پاکستان کو خراب کر دیا ہے۔ کیا ضرورت تھی تمھیں پاکستان آنے کی"۔ میں زمین پر بیٹھ گیا اور کہا کہ "زمین پر بیٹھنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں، یہ تو میری ماں ہے اور مجھے اپنی ماں سے عشق ہے۔" اس سے وہ اور زیادہ ناراض ہوا اور مارنے کا حکم دیا۔ اس رات مجھے برف کی سِل پہ لٹایا گیا اور پھر ایک سپاہی نے "پیچ پتر" کو چوم کر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ دو ضربوں کے بعد ہی میں بیہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو رسیوں میں جکڑا ہوا پایا۔ ہم ۲۴ دن تک حوالات میں رہے۔ ہر رات ہم پر تشدد کیا جاتا تھا۔ ہمیں کسی رشتے دار سے نہیں ملنے دیا جاتا تھا اور پانچ پانچ گھنٹے تک "پانی، پانی" پکارتے رہتے تھے جب کہیں جا کر پانی دیا جاتا تھا۔ حوالات کی جس کھولی میں ہم بند تھے ضروریات حوائج سے وہیں فارغ ہوتے تھے۔"

"سرسری فوجی عدالت سے ایک سال کی سزا پانے کے بعد شیر افضل، فتح یاب، جوہر حسین اور مجھے بہاولپور جیل منتقل کر دیا گیا۔

(جاری ہے)

اقبال میمن نے جان کی بازی لگا دی مگر جھوٹا بیان نہ دیا

اقبال میمن مرحوم این ایس ایف کے مخلص اور سرگرم کارکن تھے۔ پولیس انہیں گرفتار کر کے الاکو ہاؤس لے گئی جہاں اُن پہ "پلستر" چڑھانے کے بعد کہا گیا کہ "اگر تم اپنے بیان میں یہ لکھ دو کہ ہم کمیونسٹ ہیں، روس اور چین سے ملتے ہیں تو تمھیں چھوڑ دیا جائے گا۔" اقبال میمن نے جھوٹا بیان دینے سے انکار کر دیا تو پولیس کو اس کی یہ جسارت ناگوار گزری۔ بید حرکت میں آ گئے۔ مارتے مارتے تھک گئے تو برف کی ایک سِل منگوائی گئی۔ فروری کا مہینہ تھا۔ سردی پڑ رہی تھی لیکن عوام کی دولت پر پلنے والی پولیس نے اقبال میمن پر ترس نہ کھایا۔ اُسے برہنہ کر کے برف پر لٹا دیا اور جسم رسیوں سے جکڑ دیا۔ پولیس جھوٹا بیان دینے پر اصرار کرتی رہی۔ لیکن اقبال میمن اپنے بیان پر ڈٹا رہا۔ پھر اس کے جسم میں برف کے ٹکڑے داخل کئے گئے۔ درد اور کرب کی شدت سے چلایا تو اُس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ اقبال میمن درد سے تڑپ رہا تھا، پولیس کے حکام خوش ہو رہے تھے۔ کیونکہ اِن کے ضمیر سرمایہ داروں نے چبا لئے تھے۔ اور جب انسان کا ضمیر مُردہ ہو جاتا ہے تو ظلم کی کوئی حد رہتی ہے نہ حساب۔ غرض کہ جب اقبال بے ہوش ہو گئے تو انھیں الاکو ہاؤس میں ہی ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا دوسرے دن انھیں ہوش آیا تو پھر پولیس نے اپنا موقف دہرایا۔ اپنے عذاب اور عتاب سے ڈرایا۔ انکار کی صورت میں پھر "پیچ پتر" کا استعمال کیا گیا۔ یہ ظلم و ستم تین دن تک روا رکھا گیا۔ ان تینوں دنوں میں ایک دانہ بھی اقبال میمن کے منہ میں گیا نہ پانی کی ایک بوند۔

اقبال میمن تین دن کے بھوکے پیاسے تھے۔ ان کا توانا جسم نحیف و نزار ہو چکا تھا کہ تیسری شب پولیس کا باریش ڈی ایس پی ایک ٹرے میں کھانا سجا کر کمرے میں داخل ہوا۔ کھانے سے گرم، تیز اور پُرلطف خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ اقبال میمن کی بھوک اک دم جاگ اُٹھی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے۔ ڈی ایس پی نے اُنہیں سہارا دیا، اور کھانا سامنے رکھ دیا۔ اقبال نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اُس باریش پولیس افسر نے ٹرے ایک دم کھینچ لی۔ اور کہا کہ "کھانے سے پہلے اس بیان پر دستخط کر دو۔" اقبال نے بیان پڑھا، لکھا تھا "ہم کمیونسٹ ہیں روس اور چین سے ہمیں پیسے ملتے ہیں......" اقبال نے اتنا پڑھنے کے بعد بیان پھاڑ دیا۔ اور بجلی کی تیزی سے اس باریش ڈی ایس پی نے منہ پر تھوک دیا۔ اور کہا کہ "میں اپنے عوام اور دیش سے غداری نہیں کر سکتا۔ میرا جرم یہی ہے کہ میں استحصالی نظام کا خاتمہ چاہتا ہوں۔"

اقبال میمن پر ایک ہفتہ تک الاکو ہاؤس کے اذیت خانے میں ظلم و تشدد کا ہر طریقہ روا رکھا گیا۔ ایک ہفتے کے بعد اُسے حوالات میں بھیج دیا گیا۔ اس حوالات میں معراج محمد خاں بھی تھے۔ معراج کا کہنا ہے کہ وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ پہلے پہل ہم اُسے پہچان نہ سکے۔ اس نے حوالات میں داخل ہوتے ہی کہا "روٹی دو" ایک کونے میں سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا، اس پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں لیکن اقبال میمن اسی ٹکڑے پر ٹوٹ پڑا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چیونٹیوں بھری روٹی نگل گئے۔

اقبال میمن پر اس تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوامیر اور ذہنی امراض کا شکار ہو گئے۔ اور اس کا اختتام اُن کی خودکشی پر ہوا۔



مشرقِ وسطیٰ نئی جنگ کے دہانے پر

فیصلہ بندوق سے ہوگا

ڈاکٹر جارج حباش

مشرقِ وسطیٰ میں ۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو جنگ بندی کا معاہدہ ختم ہوگیا۔ اسرائیلی توسیع پسندوں کی مسلسل ہٹ دھرمی اور امریکی سامراج کے مکروہ عزائم کے سبب مشرقِ وسطیٰ ایک بار پھر ہولناک جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہے۔ اسرائیلیوں نے صحرائے سینا میں اپنی مسلح افواج کی قوت میں زبردست اضافہ کردیا ہے۔ جس میں توپخانہ بکتر بند دستے اور میزائل یونٹ بھی شامل ہیں۔ اسرائیلیوں نے فضائیہ کے کئی یونٹوں کو بھی صحرائے سینا کے اڈوں سے نہر سویز کے محاذ پر پہنچا دیا ہے۔ یہ ساری جنگی کارروائیاں اس بات کی غمازی کررہی ہیں کہ امریکی سامراج کی حمایت اور تعاون سے اسرائیل توسیع پسند مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئی ہولناک جنگ کا بگل بجانے والے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں جون ۱۹۶۷ء میں جنگ کے بعد ۸ اگست ۱۹۷۰ء کو اس معاہدے میں مزید نوے دن کی توسیع کردی گئی۔ اس کے بعد مزید ایک ماہ کی توسیع کی گئی۔ اس دوران اقوام متحدہ کے ڈاکٹر یارنگ مشرقِ وسطیٰ میں ایک پائیدار امن کے قیام کے لئے مسلسل بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ ڈاکٹر یارنگ مشن سے مسلسل تعاون اور خیر سگالی کے جذبے کا اظہار کرتا رہا۔ صدر انور سادات نے اس بات کا واضح طور پر اعلان کردیا تھا کہ متحدہ عرب جمہوریہ جنگ بندی کے معاہدے میں مزید توسیع اس صورت میں گوارا کرے گا کہ اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں سے اپنی فوجیں ہٹالے۔ کیونکہ اس کے بغیر مشرقِ وسطیٰ میں ایک پائیدار امن کا خواب شرمندۂ تکمیل نہ ہوگا۔ مگر اسرائیل نے مصر کے اس "دوستانہ" پیش کش کی قدر نہ کی اور مقبوضہ عرب علاقے شرم الشیخ، صحرائے سینا، گولان کی پہاڑیوں سے فوجیں واپس ہٹانے سے صاف طور پر انکار کرکے اپنے جارحانہ عزائم کو واضح کردیا ہے۔

ادھر اقوام متحدہ میں مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے پر چار بڑی طاقتوں کی کانفرنس کسی مشترکہ فارمولے پر متفق نہ ہوسکی۔ کانفرنس کے دوران امریکی وفد نے جو موقف اختیار کیا اس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ امریکی سامراج اور اسرائیلی توسیع پسند مشرقِ وسطیٰ کے کسی پُرامن تصفیے پر راضی نہ ہوں گے بلکہ اپنے اغراض کی تکمیل کے لئے جنگ کو مزید طول دیں گے۔ کانفرنس میں امریکہ نے کسی پُرامن تصفیے کے لئے اسرائیل پر دباؤ ڈالنے سے صاف طور پر انکار کردیا۔ امریکی صدر نکسن نے بھی اپنی حالیہ تقریر میں اس بات کا اعلان کیا ہے کہ امریکہ مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کے حل کے بارے میں اپنی کوئی تجویز اسرائیل پر زبردستی نہیں تھوپے گا۔

امریکی سامراج کے اس منافقانہ رویئے اور اسرائیلی توسیع پسندوں کی مسلسل ہٹ دھرمی سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ جو مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کو "پُرامن بقائے باہمی" کے اصول پر حل کرنے کا خوبصورت خواب دیکھ رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر اوتھان بار بار امن کی دہائی دے کر تھک چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے ڈاکٹر یارنگ مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد بالآخر یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوگئے کہ "اسرائیل ان کی کوششوں کا جواب مثبت انداز میں نہیں دے رہا ہے۔"

اسرائیل مشرقِ وسطیٰ کے حل کے بارے میں متحدہ عرب جمہوریہ، روس اور اقوام متحدہ کے مفاہمانہ رویئے اور خیر سگالی کے جذبے کو ایک بار نہیں سینکڑوں بار ٹھکرا چکا ہے۔ اور اپنے جارحانہ موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ اس صورت حال سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک پائیدار امن کے قیام اور فلسطین کے ایک منصفانہ حل کے سلسلے میں متحدہ عرب جمہوریہ اور روس کی "پُرامن بقائے باہمی" کے تحت کی جانے والی کوششوں کا اب تک کیا مثبت نتیجہ برآمد ہوا؟ کیا امریکی سامراج نے اپنی سازشیں ترک کردیں؟ کیا اسرائیلی توسیع پسندوں کے ناپاک عزائم میں کوئی کمی واقع ہوئی؟ کیا فلسطینی مہاجرین کی مستقل آبادکاری اور ان کے مسائل حل ہوگئے ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر عرب ریاستوں کو خصوصاً روس کے زیر اثر ممالک کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک پائیدار منصفانہ اور مستقل حل کے حصول کے لئے انہیں بات چیت ختم کرنی ہوگی۔ تھکا دینے والی پُرامن گفت و شنید کا سلسلہ توڑنا ہوگا۔ اور بندوق کے ذریعہ آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے اور جلد یا بدیر بالآخر اس معرکے کے فیصلے پر انہیں پہنچنا ہوگا۔

فلسطینی حریت پسندوں کا اجلاس

گذشتہ دنوں قاہرہ میں عرب نیشنل کونسل کا اجلاس کسی فیصلے کے بغیر ہی ختم کردیا گیا۔ اس اجلاس میں حریت پسند تنظیموں کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے اور انہیں ایک تنظیم کے تحت متحد کرنے کا مسئلہ زیر غور تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس مسئلے پر اتفاق رائے نہ ہوسکا۔ اور اجلاس کی کارروائی کا کوئی موثر اور ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہوسکا جس کی توقع کی جارہی تھی۔

ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ اختلاف کی نوعیت کس قسم کی تھی۔ لیکن حریت پسندوں کی ایک موثر تنظیم کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا ایک ایسے وقت میں جبکہ مشرقِ وسطیٰ میں جنگ بندی کا معاہدہ ختم ہوچکا ہے اور عرب ممالک کی سرحدوں پر اسرائیلی توسیع پسند اپنی قوت میں برابر اضافہ کررہے ہیں۔ حریت پسند تنظیموں کو فروعی معاملات سے گریز کرتے ہوئے اپنے آپ کو مضبوط اور اپنی کارروائیوں کو موثر بنانا ہے۔

تاکہ امریکی سامراج، اسرائیلی توسیع پسند اور اردن کے رجعت پسند حکمران شاہ حسین کی عرب دشمن اور عوام دشمن کارروائیوں کا منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔ ایک ایسے نازک وقت میں جبکہ عرب عوام اور دنیا بھر کے انصاف پسند عوام کی نگاہیں نیشنل کونسل کے اجلاس کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ اجلاس کا اس طرح سے ختم ہو جانا چنداں خوشگوار معلوم نہیں ہوتا۔ عرب تنظیموں کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے ہمہ وقت چوکنا رہنا ہوگا۔ کیونکہ کھلے ہوئے دشمنوں کے علاوہ بعض "گھر کے بھیدی" حریت پسندوں کی موثر کارروائی سے نالاں ہیں۔ اور وہ کسی طرح ان کے ہاتھوں سے بندوق واپس لینے کے لئے سازشیں کر رہے ہیں۔ حریت پسندوں کو اندرون خانہ تمام سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے امریکی سامراج اور اسرائیلی توسیع پسندوں کے عزائم کو خاک میں ملانا ہوگا۔ عرب عوام کی نگاہیں اپنی نجات کے لئے انہیں دیکھ رہی ہیں۔

لاؤس کی تازہ ترین صورت حال

لاؤس میں شمالی ویت نام کے حریت پسند امریکی سامراج اور اس کی پھٹو فوج کی مسلسل پٹائی کر رہے ہیں۔ تازہ ترین صورت حال کے مطابق حریت پسندوں نے بولوون ہائی لینڈ کے جنوب مشرقی حصے میں دشمن کی فوجی چوکیوں پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے ہیں۔ سائیگان کے ایک سرکاری اعلان میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ سرکاری فوج حریت پسندوں کے ہاتھوں شرمناک شکست کھانے کے بعد دریائے میکانگ سے ۱۲۵ میل دور جنوب مشرق میں چار فوجی چوکیاں خالی کر کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ گذشتہ چند دنوں سے حریت پسندوں نے ان چوکیوں پر راکٹوں سے حملہ کر کے تباہی مچا رکھی ہے۔

اس سے قبل حریت پسندوں نے ونتیان کے شمال مشرق سے ۷۰ میل دور راکٹوں سے حملہ کر کے لانگ چنگ کے خفیہ اڈے کو ملیامیٹ کر دیا۔ اس حملے میں شاہ کی رہائش گاہ کا ایک حصہ بھی تباہ ہو گیا۔ گذشتہ روز حریت پسندوں نے مزید امریکی ہیلی کاپٹر مار گرائے۔ چار روزہ جنگ میں صرف کھیسان کے محاذ پر دشمن کے ۴۲۵ سپاہی ہلاک کر دیئے گئے۔ علاوہ ازیں ۱۶ فوجی گاڑیاں اور تیل کے ایک بڑے ذخیرے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ کنتم (KONTUM) کے محاذ پر اب تک ۷۰۰ سامراج کے تنخواہ دار فوجی ہلاک کئے جا چکے ہیں اور تقریباً ۱۶۰ سپاہیوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ لاؤس میں ۸ فروری سے تا حال گرائے جانے والے امریکی طیاروں کی تعداد ۹۰۰،۳ تک پہنچ چکی ہے۔

امریکی سامراج نے ویت نام، ویت نام کے بعد کمبوڈیا اور پھر لاؤس میں جس ناپاک مقصد کے حصول کے لئے جنگ چھیڑی تھی، وہ مقصد پورا نہ ہوا بلکہ امریکی سامراج جنگ میں اپنے آپ کو گلے گلے تک پھنسا بیٹھا ہے۔ ہیلی کاپٹرز، بمبار طیارے، گولہ بارود اور اسلحہ کی تباہی الگ رہی۔ اب تک ہزاروں امریکی سپاہی اپنی جان گنوا چکے ہیں۔ امریکہ کے طول و عرض میں نکسن کی جنگی کارروائی کے خلاف روزانہ مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اور باہر کے ملکوں میں اس کے سفارت خانوں کو نذر آتش کیا جا رہا ہے۔ دنیا بھر کے محنت کش عوام، لاؤس میں امریکی اور سائیگان کی زرخرید حکومت کی جنگی پالیسی اور انسان دشمن کارروائیوں کے خلاف شدید نفرت اور غیض و غضب کا اظہار کر رہے ہیں۔

امریکی سامراج ہند چینی کی موجودہ صورتحال سے شدید مایوس ہے اور اس مایوسی کے عالم میں پے در پے ایسی حرکتیں کر رہا ہے جس سے جنگ کا دائرہ کم ہونے کے بجائے تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔ چند دن پیشتر امریکی سامراج کے تقریباً ایک ہزار بمبار طیارے لاؤس، کمبوڈیا اور ویت نام میں سائیگان کے بزدل سپاہیوں کی امداد کے لئے روانہ کئے جا چکے ہیں۔ سامراج کی طرف سے شمالی ویت نام پر بار بار کھلے ہوئے حملے کی دھمکی دی جا رہی ہے جس سے ہند چینی میں جنگ کی صورت حال مزید بگڑتی جا رہی ہے۔ سیاسی مبصروں کا خیال ہے کہ نکسن ہند چینی میں اپنی ساکھ بحال کرنے کے لئے ممکن ہے، شمالی ویت نام پر کھل کر حملے کا اعلان کر دیں۔ اور ہند چینی میں ایٹمی اسلحہ کی جنگ چھیڑ دیں۔

امریکی سامراج کمبوڈیا، لاؤس اور ویت نام میں اپنی جنگی کارروائیوں کے سبب دنیا بھر کے امن پسند محنت کش عوام کی نفرتوں کا مرکز بنتا جا رہا ہے اور روز بروز مہذب دنیا سے اس کا رشتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی انسان دشمن کارروائیوں

حریت پسندوں نے امریکہ اور جنوبی ویتنام کے ۶۶ بمبار طیارے اور امریکی ہیلی کاپٹر گرا لئے

اور جنگی جرائم سے توبہ نہیں کرتا۔ اگر ایسی کوئی توقع ہم اس سے باندھ لیں تو یہ ہماری غلطی ہوگی۔ سامراج بستر مرگ پر اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں مصروف ہے۔ یہ اس کی آخری اور بدترین کوشش ہے لیکن ایک بات طے شدہ ہے کہ سامراج اس وقت اپنی بقا کی جو جنگ لڑنے میں مصروف ہے وہ اس کی موت سے پہلے کی آخری جدوجہد ہے امریکی سامراج نے ہند چینی میں ہولناک جنگی مہم کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے بالآخر اس کے بدترین نتائج بھگتنے ہوں گے۔ فتح ہند چینی اور دنیا بھر کے محنت کش عوام کی ہوگی۔

چین کی فضائی حدود کی خلاف ورزی

امریکی سامراج، ہند چینی میں جنگ کے دائرے کو لاؤس تک پھیلانے کے بعد اب چین کی آزادی خود مختاری اور سالمیت کو چیلنج کر رہا ہے۔ اس کے جاسوس طیارے سینکڑوں بار چین کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کر چکے ہیں۔ گذشتہ دنوں ایک بار پھر امریکہ کے ایک جاسوس طیارے نے چین کی فضائی حدود میں پرواز کرتے ہوئے غیر ملکی سرحدوں کی پابندی اور احترام کے تمام اصول توڑ دیئے۔ چین کے خلاف امریکی سامراج کی یہ جارحانہ سرگرمیاں اس کے گھناؤنے عزائم کی چغلی کھا رہی ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح چین کو اکسا کر اسے براہ راست ہند چینی کی جنگ میں ملوث کرنا چاہتا ہے۔

چین نے امریکی طیارے کی اس ننگی جارحیت پر سخت احتجاج کرتے ہوئے امریکہ کو ۴۸ وارننگ دے دی ہے۔ سامراج اپنی بچھائی ہوئی بساط پر چین کو جنگ کی دعوت دے رہا ہے۔ مگر شاید امریکی سامراج کو خبر نہیں ہے کہ چین کے ستر کروڑ عوام اس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار نہ ہوں گے وہ ایک دن براہ راست امریکی سامراج سے ٹکر لیں گے مگر یہ جنگ سامراج کے حسب منشا سوچے ہوئے خطوط پر نہ ہوگی بلکہ چینی عوام کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہوگی۔ امریکی سامراج کو نوشتہ دیوار پڑھ لینا چاہیئے۔ اور اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنا چاہیئے۔

برطانیہ میں تارکین وطن کا مسئلہ

گذشتہ دنوں برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بل منظور کیا گیا جس کے تحت غیر ملکی اور دولت مشترکہ کے تارکین وطن کے داخلہ پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ اس پابندی کی حد کا تعین ملک کی اقتصادی صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد کیا جائے گا۔ اس بل پر نکتہ چینی کرتے ہوئے سابق وزیر داخلہ جیمس کالاگھان نے کہا کہ اس بل کے نفاذ کی فوری ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ تارکین وطن پر پہلے ہی پابندیاں عائد ہیں۔

برطانیہ کے انتخابات میں موقع پرست لیبر پارٹی کی ناکامی اور ایڈورڈ ہیتھ کی رجعت پسند ٹوری پارٹی کی غیر متوقع کامیابی کے بعد ہی سے برطانیہ میں تارکین وطن کے خلاف سخت موقف اختیار کئے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ بین الاقوامی معاملات میں امریکی سامراج کی دم چھلا بننے والی برطانوی حکومت اپنے داخلی امور میں بھی سامراج کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ اور دولت مشترکہ کے ان باشندوں پر طرح طرح کی قانونی، سیاسی اور معاشی پابندیاں عائد کر رہی ہے۔ جن کی مسلسل محنت اور ہاتھوں کی حرکت سے برطانیہ کے کارخانوں اور ملوں کے دل دھڑکتے ہیں۔

مارشل کاؤ کی نے لاؤس میں حریت پسندوں کے ہاتھوں اپنی اور امریکی افواج کی پٹائی کا اعتراف کر لیا

ہیل سلاسی کا حبشہ سامراج کی آغوش میں

نسیم احمد باجوہ

۱۸ر جون ۱۹۶۹ء کو کراچی کے ہوائی اڈہ پر اریٹیریا کے تین مجاہدوں نے حبشہ کے طیارہ کو تباہ کرنے کی کوشش کی تو چشم زدن میں ان کی جنگ آزادی نے دنیا بھر کی توجہ کو اپنی طرف متعطف کرالیا۔ دسمبر میں اس جنگ آزادی کا تذکرہ ایک بار پھر دنیا کے اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوا۔ برطانوی پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ہمیں اریٹیریا کے محاذ آزادی کی سرگرمیوں کا خلاصہ بتایا۔ اخبارات نے ایک ایسی ریل گاڑی کی تصویر بھی شائع کی جو محاذ آزادی کی بارودی سرنگوں کا شکار ہو چکی تھی۔ روزنامہ ٹائمز کی ۳۰ر دسمبر کی اشاعت میں ہم نے محاذ آزادی کا اعلان پڑھا۔ اس میں عالمی رائے عامہ کو مخاطب کیا گیا تھا۔ اس اعلان کے مطابق وسط دسمبر میں حبشہ کی حکومت نے اریٹیریا کے صوبہ میں ہنگامی حالات کے قوانین نافذ کر دیئے تھے۔ اور اس صوبہ کے عوام کے قتل عام پر کمر باندھ لی تھی۔ حبشہ کی بری اور فضائی افواج کی اندھا دھند انتقامی گولہ باری صرف دو ہفتوں کے اندر ایک ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔ محاذ آزادی کے سیکرٹری جنرل جناب محمد عثمان محمد صبیح نے اپنے اعلانیہ میں انکشاف کیا کہ حبشہ کی فوج کے اس وحشیانہ پیش قدمی اور رسم چنگیزی کی پیروی نے ۲۷۰۰۰ ہزار لوگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے پڑوسی ملک سوڈان بھاگ جائیں۔ حبشہ کی فضائیہ کی بے دریغ بمباری نے ہزاروں لوگوں کو بے گھر کر دیا ہے۔ کئی آبادیاں خوراک سے محروم ہو گئی ہیں۔ وہاں بچے، عورتیں اور بوڑھے کئی کئی دن سے فاقے کر رہے ہیں۔ وہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترس گئے ہیں۔ مگر حملہ آور فوج نے 'مقبوضہ' علاقوں کی مکمل ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ محاذ آزادی نے عالمی مداخلت کی اپیل کی ہے تاکہ اریٹیریا کے عوام کو اننے خوفناک عذاب سے بچایا جا سکے۔ محاذ نے عدن میں اپنے صدر دفتر سے محاذ کے تین بڑے مددگاروں اور حلیفوں — لیبیا، شام اور عراق کی حکومتوں سے درخواست کی ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کریں۔ مہاجرین اور بے گھروں کی آبادکاری اور ہزاروں زخمیوں کے علاج کے لئے جس سرمایہ، عمارتی سامان اور دوائیوں کی اشد ضرورت ہے۔ وہ بھی ریڈکراس جیسا کوئی بین الاقوامی ادارہ مہیا کرے گا تو ہزاروں مظلوم انسانوں کے دکھوں کا مداوا ہو سکے گا۔ ورنہ ان کی تباہی و بربادی میں حبشہ کی حکومت نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

ایک اندازہ کے مطابق محاذ آزادی دو ہزار کے لگ بھگ مجاہدین پر مشتمل ہے جو حبشہ کے خلاف گوریلا طرز کی مسلح جدوجہد کر رہے ہیں۔ (۱۲ر نومبر کو حبشہ کی دوسری آرمی کا کمانڈر — میجر جنرل آرگیلو اس محاذ کے ایک چھاپہ مار دستہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا)، محاذ آزادی کی مسلح عوامی جنگ کی عمر نو برس ہے۔ حبشہ کی کل فوج چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ اور اس کا زیادہ حصہ ہر وقت محاذ آزادی کے خلاف لڑائی میں مصروف رہتا ہے۔ 'سرخ سویرا' لندن میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں ہماری توجہ حبشہ کی رجعت پسند حکومت اور امریکی سامراج کی "خاص دوستی" کی طرف مبذول کرائی گئی۔ اس دوستی کا پس منظر یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ امریکی سرمایہ داروں نے حبشہ میں لاکھوں ڈالر کاروبار میں لگا رکھے ہیں بلکہ کاگنیو میں امریکہ کا ایک بہت بڑا فوجی اڈا بھی بنا ہوا ہے۔ "سرخ سویرا" میں مشہور امریکی رسالہ — یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ" کی ایک حالیہ اشاعت میں سے ایک اقتباس کا ترجمہ بھی چھپا۔ "براعظم افریقہ کے لئے کل امریکی فوجی امداد کا نصف حصہ (دس کروڑ ڈالر) صرف حبشہ کے لئے وقف ہے۔ فوجی امداد کے علاوہ امریکہ حبشہ کو تیارہ کروڑ ڈالر کی مالی امداد بھی دے چکا ہے۔ اس علاقہ کے 'استحکام' اور افریقہ کے دوسرے حصوں میں امریکی اثر و رسوخ پھیلانے کے لئے حبشہ بہت مفید اڈہ ثابت ہوا ہے"۔ نو سال قبل جنگ آزادی صرف بارہ مجاہدوں نے شروع کی تھی۔ جن کے پاس دس پرانی خستہ حال اطالوی رائفلوں کے علاوہ اور کوئی اسلحہ نہ تھا۔ اب مجاہدین کے پاس جدید چینی اور روسی اسلحہ کی کمی نہیں۔ اور وہ اپنی سرزمین کے کافی بڑے حصہ کو حبشہ کی حکومت کے سرکاری تسلط سے آزاد کرا چکے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں تین اہم پلوں اور ریل گاڑی کے پانچ ڈبلوں کو بارود سے اڑا دیا۔ سامراج کے ناطہ سے اسرائیل اور حبشہ کی حکومتیں آپس میں گہری دوست ہیں۔ آپ حبشہ میں اسرائیلی اثر و رسوخ کی وسعت کا اندازہ ان باتوں سے کر لیں کہ عدلیس ابابا میں ٹریفک کنٹرول، ساوا کی بندرگاہ مرکزی بلڈنگ سڑکوں اور مکانوں کی تعمیر، دواسازی، ماہی گیری اور سیکورٹی پولیس سے لے کر فوجی تربیت تک ہر شعبہ میں اسرائیلی 'مشیر' سیاہ سفید کے مالک ہیں اور پوری طرح بااختیار ہیں۔ حبشہ کے سیاسی اور معاشی حالات کے مطالعہ سے اس امر کا ایک بار پھر احساس ہوتا ہے کہ اسرائیل مشرق وسطیٰ کے جسم پر سامراجیوں کا پیدا کردہ خطرناک ناسور ہے۔ ہمیں فلسطینی انقلاب سے بجا طور پر یہ امید ہے کہ وہ مستقبل قریب میں اسے کاٹ کر پھینک دے گا۔

بھارت میں فی کس آمدنی ۵۰ روپے

ٹائمز کی اشاعت مورخہ ۴ر جنوری میں ایک بھارتی رسالہ "اسٹریٹڈ ویکلی" کا ایک اقتباس شائع کیا گیا جس میں سوال کیا گیا تھا کہ جب بھارت کے اوسط شہری کی سالانہ اوسط آمدنی صرف ۵۰ روپے ماہانہ ہے تو وزیر کی ماہانہ تنخواہ ۵ ہزار روپے کیوں ہے؟ بھارت میں ایک وزیر اسی ملک کے ایک عام انسان سے سو گنا زیادہ تنخواہ کیوں لیتا ہے؟ (برطانیہ میں کابینہ کے ارکان کی تنخواہ مزدوروں کی اوسط اجرت سے بمشکل ۶ گنا زیادہ ہے) بھارت میں وزیروں کو شاندار کوٹھیوں کے علاوہ نوکروں اور ذاتی ملازمین کی فوج حکومت کی طرف سے مفت ملتی ہے۔

بھارت میں وزیروں کی کل تعداد (مرکزی اور صوبائی) ۵۰۰ سے زائد ہے جو کہ عالمی ریکارڈ ہے۔ مسز گاندھی اپنے اقتدار کی خاطر عوام میں مقبول ہونے کے لئے اکثر سوشلزم کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ (یہ بری عادت انہیں اپنے باپ سے ورثہ میں ملی ہے) سوال یہ ہے کہ ان کی سوشلزم کا مفہوم کیا ہے؟ کیا وہ ایک کھوکھلا اور گمراہ کن نعرہ بلند نہیں کر رہیں؟ مذکورہ ہفت روزہ نے پوچھا ہے کہ جب اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ہر روز ۲۰ کروڑ بھارتی باشندے ایک وقت کا کھانا کھائے بغیر بھوکے سو جاتے ہیں۔ تو کانگریس کس منہ سے موجودہ نظام کو سوشلزم کا نام دیتی ہے؟

یوراگوائے میں ۵۰ سیاسی قیدی ہیں

ماضی قریب میں انقلابی جدوجہد نے جو شکلیں اختیار کی ہیں ان میں لاطینی امریکہ کی "شہری گوریلا جنگ" کو نمایاں مقام حاصل ہے پچھلے دنوں یوراگوائے میں برطانوی سفیر کے اغوا نے اسے ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ یوراگوائے کے انقلابی 'ٹوپامارو' کہلاتے ہیں۔ انہوں نے یہ نام انکا نسل کے اس قبائلی سردار کی یاد میں رکھا ہے۔ جس نے دو سو سال قبل ہسپانیہ کے سامراجی تسلط کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اور اس جرم کی سزا اسے زندہ چیر پھاڑ کر دی گئی۔ ان

الفتح

لاطینی امریکہ کے حریت پسند

طبقاتی جدوجہد کو تیز کر رہے ہیں

انقلابیوں نے لینن کے اس قول کو اپنایا ہے۔ "بدتر حالات بہتر ہوتے ہیں"۔ وہ آمرانہ اور تسلطی حکومت کے بڑھتے ہوئے ظلم و تشدد سے گھبرانے کی بجائے اسے خیر مقدم کہتے ہیں۔ انقلابیوں نے زیر زمین تنظیم کا جو جال بچھا رکھا ہے اسے سرکاری محکموں (جن میں پولیس شامل ہے) اور کاروباری دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد کا تعاون حاصل ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ اس وقت یوروگوائے میں سیاسی قیدیوں کی تعداد ۵۰ ہے۔ خفیہ پولیس ان پر ناقابل بیان تشدد کر رہی ہے۔ انقلابی انہیں ہر قیمت پر رہا کرانا چاہتے ہیں۔ پانچ ماہ قبل انہوں نے دو امریکی "مشیروں" اور برازیل کے ایک ڈپلومیٹ کو اغوا کیا تھا اور ابھی تک رہا نہیں کیا۔ گویرا کی حکمت عملی کے برعکس یوراگوائے اور برازیل کے نوجوان انقلابی لاطینی امریکہ کے شہروں کو گوریلا جنگ کا مرکز بنانے کے حق میں ہیں۔ اُن کے خیال میں لاطینی امریکہ کے شہر سیاسی اقتدار کا سرچشمہ ہیں اور معاشی قوت کا نشان اوّل۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انقلابیوں نے شہروں میں زبردست کارنامے انجام دے کر اپنے نظریہ کو سچا ثابت کر دکھایا۔ اور لاطینی امریکہ کی نئی حکومت کے اعصابی مراکز کو معطل کر دیا۔ انقلابیوں کے نزدیک شہروں کا وہی مقام ہے جو ویت کانگ کی نظروں میں جنگلوں کا۔ "ٹوپامارو" تے بنک لوٹے ہیں۔ پولیس اور فوج کی بیرکوں پر گولیاں برسائی ہیں۔ ایک بار انہوں نے ملک کا سب سے بڑا جوا خانہ لوٹا تو ملازمین کے ٹپ کی رقم واپس کر دی۔ ۱۲ ار نومبر ۱۹۶۹ء کو گیارہ انقلابیوں (آٹھ مرد اور تین عورتوں) نے یوراگوائے کے سٹیٹ بنک پر ڈاکہ ڈالا اور چالیس لاکھ ڈالر کی مالیت کے جواہرات لے اڑے۔ ۴۸۰۰۰ ڈالر کی نقدی بھی ان کے ہاتھ لگی۔ جون ۱۹۶۸ء میں یوراگوائے کی حکومت نے ایک حکم نامہ جاری کیا تھا جس کے مطابق اجرتوں میں اضافہ پر پابندی لگا دی گئی۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں ٹریڈ یونین انجمنوں نے ملک بھر میں ہڑتال کرائی تاکہ ڈھائی سال کے عرصہ میں اشیائے صرف کی قیمتوں میں ۱۴۱ فیصدی اضافہ پر احتجاج کیا جا سکے۔ "ٹوپامارو" دو ہزار کے لگ بھگ انقلابیوں پر مشتمل ہے۔ وہ پانچ سال سے سرگرم عمل ہے۔ اس نے شمالی یوراگوائے میں گنے کی کاشت کرنے والے کسانوں کی طبقاتی جدوجہد کی شدت اور جمہوری سوشلسٹ جماعتوں کی انقلاب دشمنی، موقع پرستی اور ترمیم پسندی کے ردعمل کے طور پر جنم لیا تھا۔ یہ انقلابی اب صرف سیاسی قیدی ہی رہا نہیں کرانا چاہتے بلکہ ان کے مطالبات میں شہری حقوق کی بحالی، تعلیمی اداروں کی مکمل آزادی، آمریت کا خاتمہ اور عوام دشمن افسر شاہی کی برطرفی شامل ہے۔ انقلابیوں کا پس منظر دیکھا جائے تو یہ دلچسپ پہلو اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ ان میں سے اکثریت کا تعلق متوسط طبقہ سے ہے۔ یوراگوائے کی معاشی حالت بڑی خراب ہے۔ آبادی کے غالب حصہ کے لئے گذر اوقات کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ سرکاری محکموں کی بدانتظامی عروج پر ہے۔ عوامی بددلی اور اضطراب کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ انقلابیوں نے اپنے آپ کو بے عمل ژولیدہ فکر اور کم ظرف دانشوروں اور چائے کی پیالی پر دھواں دار بحثوں سے بڑے محفوظ فاصلہ پر رکھا ہے انہوں نے اپنے آپ کو اشتراکیت کے مختلف متحارب گروہوں کی چپقلش میں نہیں الجھایا۔ وہ نظریات کی بال کی کھال اتارنے کو ٹھوس انقلابی عمل کا نعم البدل نہیں سمجھتے۔ (جیسا کہ ترقی پسند پاکستانی دانشوروں کا دستور ہے) یوراگوائے میں مروجہ معنوں میں پرولتاریہ کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے کسانوں اور شہروں میں رہنے والے پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں نے مل کر عوامی انقلاب کے ہراول دستہ کا کردار ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ہم ان کے جذبہ سرفروشی کو سلام کرتے ہیں۔ آمریت، فاشی جرنیلوں کی بالادستی اور غربت افلاس کے وزنی پتھروں تلے پسے ہوئے عوام میں خالی باتیں کر کے یا بیان بازی کر کے یا جلسے جلوس کے ذریعہ انقلابی جذبہ بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ عروق مردہ میں تازہ زندگی دوڑانے کے لئے انقلابیوں کو اپنا سر ہتھیلی پر رکھنا پڑتا ہے۔ خون کی قربانی دینی پڑتی ہے یوراگوائے کے انقلابی ہر حربہ استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ وہ بھیس بدلنے کے ماہر ہیں ایک بار پچاس انقلابیوں نے ملاحوں کا لباس پہنا اور دارالحکومت کے عین وسط میں بحریہ کے اسلحہ خانہ پر قبضہ کر کے … جدید ہتھیار اٹھا لئے۔ ایک اور موقع پر انہوں نے ماتمی لباس پہنا اور اپنے آپ کو جنازہ میں شریک غم گساروں کی شکل دے کر ایک قصبہ پر قبضہ کر کے اس کے اس کے بنکوں سے پائی پائی لوٹ لی۔ انقلابیوں کی تنظیمی پختگی کا یہ عالم ہے کہ حکومت ہر جتن کرنے کے باوجود ان کی شناخت نہیں کر سکی۔ ان کا ایک راہنما جو پچھلے سال گرفتار ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی میں قانون کا طالب علم تھا اور یوگوسلاویہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام رال سینڈک ہے یوراگوائے کی حکومت امریکی سامراج کی خیرات کے ٹکڑوں اور سی آئی اے کے ایجنٹوں کے سہارے زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اور خود اپنی بداعمالیوں کے تیشہ سے کھودی ہوئی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے۔ پچھلے سال انقلابیوں نے صرف پولیس کا ایک امریکی مشیر اغوا کر لیا تھا بلکہ جنرل موٹرز کا کاروں کے پرزے جوڑنے والا کارخانہ آگ لگا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اس کارخانے کو جلا کر بھسم کرنے کے بعد ایک اعلانیہ میں عوام کو بتایا گیا کہ یہ پولیس کے لئے گاڑیاں بنانے کے جرم کا ارتکاب کر رہا تھا اور یہ گاڑیاں عوامی تحریک کو کچلنے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں ؎

سلام اے زمین گویرا کے نیک فرزندو!

محکمہ تعلیمات نے پون لاکھ روپے کہاں خرچ کئے

ڈائریکٹریٹ کے ملازم اسکولوں کی دکانیں کھول کر سرکاری امداد بٹور رہے ہیں

اشرف شاد

ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن کو ہمارے تعلیمی اداروں پر نگرانی کا شرف حاصل ہے۔ ان اداروں کی امداد، گرانٹ دوسرے مالی امور اور معاملات کی نگرانی کا ذمہ دار یہ ادارہ تعلیمی شعبہ میں کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کا ذکر دلچسپ بھی ہے۔ اور خاصا عبرت آموز بھی۔ تعلیم کو تجارت بنانے کے سلسلے میں جو مالی لذت تعلیمی وڈیرے حاصل کرتے ہیں اور اس میں ڈائرکٹریٹ کے کارپرداز جس طرح معاونتی ایجنٹ کا کردار ادا کرتے ہیں اس کا اجمالاً تذکرہ نیشنل کالج کے بارے میں شائع ہونے والی تحقیقاتی کمیٹی رپورٹ کے سلسلے میں ہم اس سے پہلے بھی کر چکے ہیں، کہ کس طرح ایک ادارے نے ایک گھٹیا فراڈ کے ذریعے جعلی ناموں پر سرکاری امداد وصول کی۔ اس کے ثبوت بھی حاصل ہوئے۔ لیکن اس کا آج تک کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اس قسم کی ایک تازہ بدعنوانی کی رپورٹ ایک دستاویز کے ساتھ ہم اب پھر پیش کر رہے ہیں۔ کہ کس طرح

تعلیمات کے ڈائرکٹر صاحب حکومت سے ہزاروں روپے کی رقم بٹورتے ہیں۔ اور انہیں ایسے مصرف میں لاتے ہیں جن سے کم از کم تعلیم اور معیار تعلیم کی بات ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھتی۔

ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن ہر سال مڈل کلاس کے امتحانات لیتی ہے۔ ان امتحانات میں ہر گورنمنٹ اسکول سے زیادہ سے زیادہ پچاس فی صد طلبہ کو بیٹھنے کی اجازت ہوتی ہے جبکہ باقی طلبہ صرف اسکول کے اپنے امتحانات میں بیٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ پرائیویٹ طلبہ بھی اس امتحان میں بیٹھتے ہیں۔ اس سال ان امتحانات کے اخراجات کے طور پر ڈائرکٹر آف ایجوکیشن نے سرکاری فنڈز سے جنوری ۱۹۷۱ء تک ۷۵ ہزار ۷ سو روپے حاصل کئے۔ سب سے پہلا بل ۲۷ ہزار ۹ سو ۲۶ روپے ۹۳ پیسے کا تھا جو ۴ دسمبر ۱۹۷۰ء کو جمع کرایا گیا تھا۔ مڈل کلاس کے ان معمولی امتحانات کے لئے پون لاکھ روپے کی اس خطیر رقم کا یہ بل بغیر واضح توضیحات کے جمع کرایا گیا تھا۔ ان اخراجات کی توضیحات کے لئے جب آڈیٹر کی ٹیم ڈائرکٹریٹ بھیجنے کی بات آئی تو پوری ڈائرکٹریٹ تہہ و بالا ہو گئی لیکن پیشگی اطلاع ڈائرکٹر صاحب کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا راتوں رات اکاؤنٹ تیار ہوئے۔ کسی کے دستخط بنائے گئے کچھ کے انگوٹھے لگوائے گئے۔ اور اس طرح یہ توضیحات تیار ہوئیں۔ سندھ کراچی کے کمپٹرولر آفس میں لائنیں ملائی گئیں۔ لیکن ان تمام تر توضیحات کے باوجود آڈٹ کی کانٹ چھانٹ کے بعد تقریباً ۳۷ ہزار روپے کا یہ بل ۲۷ ہزار ۶ سو ۶۴ روپے میں منظور ہوا۔

اس رقم کے علاوہ مڈل امتحانات کے اخراجات کی ہی مد میں ۳ ہزار ۳ سو ۲۵ روپے ۱۸ پیسے اور ۴ ہزار ۷ سو ۱۰ روپے ۴۹ پیسے کے دو بل منظور ہوئے۔ اور اس طرح آٹھویں جماعت کے امتحانات کے اخراجات کے طور پر جن میں صرف چند ہزار طلبہ شریک ہوتے ہیں ۷۵ ہزار ۷ سو روپے کی خطیر رقم وصول کی گئی یہ رقم کہاں کہاں اور کس طرح خرچ ہوئی اس کا علم تو ڈائرکٹر آف ایجوکیشن اور ان کے دوسرے

DIRECTORATE OF EDUCATION KARACHI REGION
KARACHI.

NO.DE/G-Exam(124)/17993 - 18000 /70. Dated :- 15/12/70

From:-

Razi-ur-Rehman,
Director of Education,
Karachi.

To

The Comptroller,
of Sind Karachi.

SUBJECT:- GRANT OF HONORARIA.

In exercise of the powers [illegible] under F.R. 46(b) vide appendix 4, F.R & S.R volume II, the under signed having been satisfied that the conduct of the Middle Standard Examination 1970 was of a special work of intermittent character and was so laborious that the following persons have devoted extra time and labour and that the services rendered does not fall with in their ordinary duties, is pleased to sanction the payment of sum of Rs. 1615.00 (Rupees One thousand Six Hundred Fifteen (Only) to the persons detailed below :-

1.	Mr. Mazhar Hussain, S.E.T [illegible] Gaudabad.	Rs. 450.00
2.	Mr. Abdus Sattar Khan, S.E.T [illegible] High School.	Rs. 425.00
3.	Mr. Zaheeruddin Qureshi, S.Clerk Development Branch.	2[illegible]0.00
4.	Mr. Athar Ali, Examination Branch.	Rs. 160.00
5.	Mr. Anwer Ali, GBSS I Jehangir Rd.	Rs. 145.00
6.	Mr. Mohammed Ali, G.B.S.S. P.T Colony.	Rs. [illegible]0.00
7.	Mr. Mohammed Saheed, GBSS I Nazimabad.	Rs. 115.00
		Rs. 161[illegible]

(RUPEES ONE THOUSAND SIX HUNDRED FIFTEEN ONLY)

The expenditure involved will be met out from the sanctioned Budget Grant of the Directorate of Education Karachi Region kut out for the current financial year 1970-71 and will be debitable to :-
"37-Education B(F) Government Secondary Schools Allowances and Honoraria.

(RAZI-UR-REHMAN)
DIRECTOR OF EDUCATION
KARACHI

Copy forwarded for information to :-
1. Bill Clerk.
2. All the concerned Clerk and incumbents.

(M.M.KAZIM BEG CHUGHTAI)
REGISTRAR
DEPARTMENTAL EXAMINATIONS
DIRECTORATE OF EDUCATION
KARACHI.

ANWER

یہ اُس بل کا عکس ہے جو ڈائریکٹر نے بغیر کسی اختیار کے سات افراد کو اعزازی رقم کی ادائیگی کے لئے منظور کیا تھا لیکن آڈٹ میں پکڑا گیا

ادیب سہیل

غزل

زعم تو ایسا تھا اُن کو ہر طرف چھا جائیں گے
یہ تو سوچا بھی نہیں تھا مات یوں کھا جائیں گے

یا وہ نعروں میں تھے یا پھر اپنے اخباروں میں تھے
کیا تھے وہ اور کیا نہیں تھے سامنے آجائیں گے

بات اتنی ہے کہ ہے فکر و نظر کا اختلاف
ہم کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے وہ کھا جائیں گے

اپنی کشتی کھے رہے ہیں جو بھی دھارے کے خلاف
اُن کے پرچم کس طرح ساحل پہ لہرا جائیں گے؟

رات کی تاریکیوں میں دار پر جو چڑھ گئے
صبح کی صُورت میں اپنا خوں بہا پا جائیں گے

چور دروازے سے کیوں آئیں گے اپنی بزم میں
ہم کو آنا ہوگا تو ہم برملا آجائیں گے

راہ میں جو آئیگا وہ ٹوٹ کر رہ جائے گا
جانے والے سُوئے منزل بے محابا جائیں گے

ذہن جن کا ارتقاء کے باب میں روشن نہیں
اے سہیل اِن سے بچو وہ اور اُلجھا جائیں گے

●

ڈیڑھ ہزار روپے کا لفافہ ڈائریکٹر صاحب کے حلق میں اٹک گیا ہے

احباب کو ہی ہوگا۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ کراچی میں تعلیم ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اور اس مسئلے کی ایک بڑی وجہ مالی وسائل کی عدم موجودگی بتائی جاتی ہے۔ لیکن جو مالی وسائل دستیاب ہیں ان کا کیا استعمال ہو رہا ہے۔ ان کی مثال پون لاکھ روپے سے زیادہ کی رقم پہ اخراجات ہیں جو ایک بہت اچھے اسکول کو چلانے کے لئے ایک سال کے واسطے کافی ہیں۔

لیکن یہ بات ابھی ان پون لاکھ روپے پر ختم نہیں ہوئی۔ اس رقم کی تقسیم کے بعد بھی کچھ ضرورت مند ایسے تھے جو بچ گئے۔ تعلیمات کے ڈائرکٹر صاحب کو ان ضرورت مندوں کے لئے مزید رقم کی ضرورت درپیش ہوئی۔ اور اس کے لئے انہوں نے اپنے مالی اختیارات کی کتاب ٹٹولی اور سات خوش نصیب افراد کو مڈل امتحانات منعقدہ ۱۹۷۰ء میں مخصوص خدمات انجام دینے پر اعزازی رقم کی منظوری دی گئی۔ ڈائرکٹر صاحب نے یہ منظوری ایف آر ۴۶ (بی) کے ذیل میں حاصل شدہ اختیارات کے تحت دی تھی۔ لیکن موصوف یہیں تھوڑے سے چوک گئے۔ یہ بل جس کا نمبر ڈی ای/جی/ ایگزامینیشن (۱۲۴)/۱۷۹۹۳-۱۸۰۰۰/ ۷۰ تھا اور جو مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو دیا گیا تھا۔ ایک ہزار ۶ سو پندرہ روپے کی مالیت کا تھا۔ اور مالی اختیارات کی جس دفعہ کے تحت ڈائرکٹر صاحب نے اس کی منظوری دی تھی اس کے تحت انہیں پانچ سو روپے کی رقم سے زیادہ منظوری دینے کا اختیار نہ تھا۔ لیکن کارکردگی کے جوش میں بات شاید ان کے دھیان سے اتر گئی۔ نتیجتاً ان کا یہ بل مسترد ہوگیا۔

اس بل کے نامنظور ہونے کے دو ماہ تک ڈائرکٹر صاحب نے پراسرار خاموشی اختیار کرلی۔ دو ماہ بعد جب انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ لوگ اس معاملے کو بھول گئے ہوں گے تو انہوں نے ۳ر فروری ۱۹۷۱ء کو ایک ہزار ۶ سو ۱۵ روپے کی اس رقم کو چار بلوں کی صورت میں تقسیم کیا۔ اور ۔/۳۰۵، ۔/۴۲۵، ۔/۴۳۵ اور ۔/۴۵۰ روپے کے چار مختلف بل آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں جمع کرائے۔ یہ چاروں بل پانچ پانچ سو روپوں سے کم کے تھے۔ لہٰذا مالی اختیارات انہیں جو حاصل ہیں اس کے تحت ان کی منظوری کا اختیار انہیں حاصل تھا۔ لیکن آڈٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ اسے بھولے نہ تھے۔ لہٰذا جب ایک بل کے ٹکڑے قانونی شکل بن کر ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے یہ معاملہ سیکرٹری ایجوکیشن تک پہنچا دیا۔ لہٰذا ڈائرکٹر صاحب پون لاکھ روپے کا تھیلہ تو بہت خاموشی کے ساتھ لے گئے تھے۔ لیکن ڈیڑھ ہزار روپے کا یہ لفافہ ان کے حلق میں اٹک گیا اور ابھی تک اٹکا ہوا ہے۔

ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم کا یہ معاملہ بظاہر چھوٹا سا ہے لیکن بڑے پیمانے پر ہوتے والے گھپلوں اور بدعنوانیوں کا ایک مثالیہ ہے۔ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن اور ایسے بہت سے سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی رگوں میں اس قسم کی جو بدعنوانیاں سرایت کرگئی ہیں۔ وہ نوکر شاہی کی فطرت ثانیہ ہیں۔ لیکن اس تجزیہ پر پہنچ کر بدعنوان افسروں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی گئیں تو وہ عوام کی رگوں سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیں گے۔

ڈائرکٹریٹ نجی اسکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں کو سرکاری گرانٹ تقسیم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ان کے اس اختیار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈائرکٹر کے بیشتر ملازموں نے مختلف محلوں میں چھوٹے چھوٹے اسکولوں کی دکانیں کھول رکھی ہیں۔ اور ان کے پردہ میں ڈائرکٹریٹ سے سرکاری امداد بٹورتے اور اپنی جیبوں کو بھاری بھرکم بناتے ہیں۔ جو لوگ ملازم نہیں ہیں ان کے اثر و رسوخ نے انہیں یہاں کا حاکم بنایا ہوا ہے۔ بڑے بڑے نجی کالجوں کی گاڑیاں اسی اثر و رسوخ کی بنا پر چل رہی ہیں۔

نوکر شاہی کے یہ کارندے عوامی رہنماؤں کی جانب سے کڑی نگرانی کی مستحق ہیں۔ ان کی پوری صفوں کو احتساب کی زنجیریں نہ پہنائی گئیں تو یہ عوام کے لہو سے اپنی معاشی عمارتیں اسی طرح مستحکم کرتے رہیں گے۔

IIIIIIIIII

الفتح

الفتح انکشاف

پچاس (۵۰) ہزار روپے سے پانچ کروڑ روپے بنا لئے

نمائندہ الفتح

زرمبادلہ ہر ملک کی طرح پاکستان کی بھی ریڑھ کی ہڈی ہے جس پر اس کی معیشت کا بھاری بھرکم پہاڑ کھڑا ہے۔ لیکن ہماری معیشت کے اجارہ داروں نے اس ریڑھ کی ہڈی پر ہمیشہ بھرپور وار کئے ہیں۔ اور اس طرح معیشت کے پہاڑ کو اوندھے منہ نیچے کی طرف جھکانے کی کوششیں کی ہیں۔ زرمبادلہ کو مختلف بدعنوانیوں اور نوکرشاہی کے ساتھ سازباز کرکے غیر ممالک کی طرف منتقل کرنے کا سلسلہ انہوں نے عرصے سے چلا رکھا ہے۔ لیکن بدعنوان نوکرشاہی ان کی پردہ پوشی کے لئے انہیں نقابیں فراہم کرنے کا کام بھی ہمیشہ کرتی رہی ہے۔ یہ نقابیں اتارنے کا فریضہ تاریخ نے جن طاقتوں کے سپرد کیا ہے، ہم اپنا شمار بھی انہیں میں کرتے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں ہمارا پہلا شکار پاکستان کی جہازی صنعت کے وہ "لارل اینڈ ہارڈی" ہیں جو ایک طرف زرمبادلہ کی چوربازاری کا کام سرانجام دے رہے ہیں تو دوسری جانب نوکرشاہی کی سرپرستی کے سہارے مشرقی پاکستان کے ساتھ زیادتیوں اور معاشی عدم توازن کی ایک وجہ بھی بن رہے ہیں۔

یونائیٹڈ اورینٹل اسٹیم شپ کمپنی جو بائیس اجارہ دار خاندانوں میں سے ایک، مولا بخش گروپ سے منسلک تھی آج کل "لارل ہارڈی" کی طرح معروف انور اور اقبال کی ملکیت ہے۔ ان کے بڑے بھائی مولا بخش ایک جھگڑے کے بعد ان سے الگ ہیں اور اس کمپنی کے ذریعے پاکستان کی معیشت پر کاری ضرب لگانے کا تمام تر فریضہ اپنے دونوں بھائیوں پر چھوڑ گئے ہیں۔ یہ ایک پارٹنر شپ فرم ہے۔ اور اس کا کل سرمایہ پچاس ہزار سے بھی کم ہے۔ لیکن اس کی ملکیت میں چھ بڑے جہاز ہیں جن کی مجموعی مالیت ۵ کروڑ روپے سے زائد ہے۔ نصف لاکھ کا سرمایہ رکھنے والی فرم ۵ کروڑ سے زائد مالیت کے جہازوں کی کیوں کر مالک ہے۔ یہ کوئی ایسا معمہ نہیں جو سمجھنے یا سمجھانے کا نہ ہو، ڈائریکٹر آف شپنگ سے ملی بھگت، کم مالیت کے جہازوں کی زیادہ مالیت کے سرٹیفکیٹ، شپ یارڈ کے حکام سے سازباز، کم ادائیگیوں پر جہازوں کی خریداری، زرمبادلہ میں گھپلے، اور ایسی ہی بدعنوانیوں کا ایک پورا جال ہے جس کے تانوں بانوں نے پانچ کروڑ روپے کی مالیت کے جہازوں کو دو آدمیوں کی جیب میں پہنچا دیا ہے۔

ابھی تھوڑے عرصے قبل اس کمپنی نے کھلنا شپ یارڈ سے مال برداری کے چھوٹے جہاز حاصل کئے۔ ان کی کل مالیت ۴۳ لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ لیکن انہیں یہ سہولت فراہم کی گئی کہ وہ دس فیصد نقد ادائیگی کریں۔ جبکہ باقی رقم آئندہ آسان قسطوں پر ادا کی جائے۔ اس طرح انہیں صرف ۳ لاکھ ۴۰ ہزار روپے کی ادائیگی پر ۴۳ لاکھ روپے کی مالیت کے سامان پر قبضہ دے دیا گیا۔

اس سلسلے میں اہم پہلو یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں ۲۷ کمپنیاں موجود ہیں جو INLAND TRANSPORTER کا کام کرتی ہیں۔ لیکن کھلنا شپ یارڈ سے ان کمپنیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ بلکہ مغربی پاکستان کی جہازی صنعت کا ایک "ٹرا" ایک قلیل سے سرمائے سے خرید کر انہیں اپنی ملکیت بنا لیتا ہے۔ کیا یہ حقیقتاً مشرقی پاکستان کے ساتھ زیادتی نہیں ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان معاشی عدم توازن کا یہ بنیادی سبب بھی دریافت ہوتا ہے کہ کس طرح نوکرشاہی اور سرمایہ دار باہمی گٹھ جوڑ کے ذریعے ناانصافیوں کی ایک ایسی فضا قائم کر رہے ہیں کہ ایک صوبے کے عوام دوسرے صوبے کے استحصال سے تنگ آکر ایک ایسی سیاسی فضا قائم کر دیتے ہیں کہ ملکی استحکام پر آنچ آتی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور اس شکایت پر مغربی پاکستان کے وہ لوگ بھی ندامت سے سر جھکا دیتے ہیں۔ جن کے اپنے جسم بھی اسی صوبے سے تعلق رکھتے جن کے اپنے جسم بھی اسی صوبے سے تعلق رکھنے والے استحصالیوں کے خونی پنجوں سے نچے ہوئے ہیں۔

یونائیٹڈ اورینٹل اسٹیم شپ نامی اس کمپنی کو ایک عرصہ ہوا کہ ایک جہاز کی خریداری کا اجازت نامہ ملا تھا لیکن اس کی خریداری عمل میں نہیں آسکی۔ حتیٰ کہ اس کی میعاد بھی ختم ہو گئی۔ اس عرصے میں کمپنی کے لارل اور ہارڈی علیحدہ علیحدہ دو مرتبہ لندن گئے۔ دو مہینے وہاں ٹھہرے۔ لیکن ہر مرتبہ خالی ہاتھ واپس آئے۔ چھ ماہ پیشتر اقبال صاحب گئے تھے۔ انہوں نے دو ماہ تک قیام کیا۔ لیکن بغیر جہاز خریدے واپس آگئے۔ اس کے بعد دوسرے بھائی حج کرنے کا بہانہ کرکے گئے۔ لیکن وہ بھی خالی ہاتھ پلٹے۔ یہ جہاز جس کے لئے حکومت کی جانب سے زرمبادلہ بھی منظور کیا گیا تھا، کیوں نہیں خریدا گیا؟ کیا لارل ہارڈی گروپ کا دیوالیہ ہو گیا ہے۔ یا مارکیٹ میں کوئی ایسا جہاز نہیں ہے جسے خریدا جا سکتا ہو؟ شاید دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ پیسے بھی موجود ہیں اور قابل فروخت جہاز

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

عدالتوں کے فیصلے انصاف کے نہیں سرکار کے

عباس رضوی

۱۴ جون ۱۹۷۰ کا واقعہ ہے کہ برازیل کی حکومت کو برازیلی چھاپہ مار تنظیموں سے تعلق رکھنے والے چوالیس چھاپہ مار قیدیوں کی رہائی کا پروانہ گم وبا کہ جاری کرنا پڑا۔ حکومت دیکھتی رہی اور یہ چھاپہ مار قید خانہ سے نکلتے ہی طیارے کے ذریعے الجیریا کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ چھاپہ ماروں نے برازیل میں مقیم جرمن سفیر کو اغوا کر لیا۔ اور اس کو یرغمال کے طور پر پاس رکھتے ہوئے اعلان کیا کہ حکومت اگر مذکورہ چوالیس چھاپہ ماروں کو آزادی کے ساتھ برازیل سے باہر نکل جانے دے تو سفیر موصوف کو رہا کر دیا جائے گا معاملہ چونکہ ایک غیر ملکی سفیر کا تھا اس لئے برازیل کی حکومت کو چھاپہ ماروں کی شرط قبول کرنی پڑی۔

اس وقت کوئی چھ کے قریب چھاپہ مار تنظیمیں ہیں جو برازیل میں سماجی انقلاب برپا کرنے کے لئے جدو جہد کر رہی ہیں۔ یہ تنظیمیں برازیل کے انقلابی رہنما چارلس ماریگھیلا کی دیہی چھاپہ ماری کے نظری اور عملی اصولوں سے دوچار ہیں۔ چارلس ماریگھیلا اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ گذشتہ سے پیوستہ سال پولیس کے ساتھ ایک جھڑپ کے دوران شہید ہو گئے۔ یہ تنظیمیں اگرچہ چارلس ماریگھیلا سے متاثر ہیں۔ مگر ان کے سیاسی پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تاہم ان میں سے اکثر تنظیمیں برازیل کی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ نظری اختلاف کی بنا پر معرض وجود میں آئیں۔ برازیل کی کمیونسٹ پارٹی بھی ان کمیونسٹ پارٹیوں کی صف میں کھڑی ہے جو انقلاب کی باتیں تو بہت بناتی ہیں، مگر بندوق نہیں اٹھاتیں۔ نیز ان چھاپہ ماروں کی صف میں ایسے فوجی عناصر بھی شامل ہیں جو برازیل کی موجودہ حکومت سے بیزار ہو کر فوج سے بغاوت کر گئے ہیں۔

ذیل میں ہم چند ایسے چھاپہ ماروں کے انٹرویو درج کرتے ہیں جن کا تعلق برازیلی چھاپہ مار تنظیموں سے ہے اور جو الجیریا میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ”دوگر“ ہے اور ان کا تعلق ”باپولما انقلابی وینگارڈ“ سے ہے۔ دوسرے صاحب ”فلیوریری“ ہیں جو ”ایکشن فارنیشنل بریشن“ سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی دو صاحب گیبیرا اور نیٹرونی ”اکتوبر تحریک“ نامی تنظیم کے رکن ہیں۔

● **سوال:** ان دنوں ریاست ہائے متحدہ میں سیاسی رہنماؤں اور سفیروں کے اغوار اور ان کی رہائی کے بدلہ میں انقلابی رہنماؤں کی رہائی کے واقعات کا بڑا چرچا ہے۔ آپ ہمیں کسی ایسے واقعہ کی روداد سنایئے جس میں کسی اہم شخصیت کا اغوا کیا گیا ہو۔

● **جواب:** جاپانی سفیر کے اغوا کا واقعہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ یہ واردات جس جگہ پہ ہوئی اس کے ایک طرف وفاقی پولیس کا مرکز تھا۔ دوسری طرف پولیس الفارمیشن کا صدر دفتر اور اس سے سو گز کے فاصلے پہ اسٹیٹ سکیورٹی کا محکمہ تھا۔ فوجی نقطہ نظر سے اغوا کی واردات ایک معمولی بات ہے مثلاً جاپانی سفیر اپنی کار میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی کار کا شوفر تھا۔ ہم ان کی کار کے پیچھے لگ گئے۔ ہمارے ایک ساتھی نے اپنی فوکس ویگن سڑک پہ اس طرح دوڑائی کہ وہ اس کے کنٹرول سے باہر ہو گئی ہے۔ ایک ساتھی نے ہاتھ کے ذریعے سفیر کی گاڑی کے ڈرائیور کو باور کرانے کی کوشش کی کہ فوکس ویگن اس کے کنٹرول سے باہر ہے۔ بہتر ہے کہ وہ گاڑی روک لے۔ ورنہ ٹکرا جانے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ ڈرائیور نے سفیر کی گاڑی روک لی۔ اس اثنا میں ہمارے چھ اور ساتھی موقعہ واردات پہ پہنچ گئے میں نے اشارہ سے ڈرائیور کو متنبہ کیا کہ وہ خاموشی اختیار کئے رہے۔ میرے ساتھیوں نے سفیر موصوف کو دبوچ لیا۔ اور ایک کار میں ڈال کر روانہ ہو گئے۔

واردات کے دوران ہم ہمیشہ اپنے پاس دو کاریں رکھتے ہیں۔ اور ان دونوں میں مسلح افراد موجود ہوتے ہیں تاکہ ضرورت پڑنے پہ گولی چلا سکیں اگر پولیس کی کوئی گاڑی ہماری کارروائی میں کوئی مداخلت کر بیٹھے تو ہم اسے ان دونوں کاروں کے بیچ میں گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس واردات میں بھی کچھ اس طرح کا واقعہ پیش آیا۔ پولیس کی ایک کار نے مداخلت کرنے کی کوشش کی تو ہم نے اسے اپنی کاروں کے بیچ میں لے لیا پولیس کی کار ہماری پچھلی کار کی زد سے باہر نکلنے کے لئے سیدھی آگے بڑھ گئی جبکہ اگلی کار بائیں موڑ کی طرف گھوم گئی۔

● **سوال:** آپ نے اغوا کو اپنا طریقہ کار کس لئے بنایا؟

● **گیبیرا:** برازیل میں اگر کسی شخص کو جیل سے رہائی دلائی ہو تو اس کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کسی سیاسی شخصیت کو اغوا کر لیا جائے اور اس کی رہائی کے بدلے میں اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا جائے۔ چھاپہ ماروں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو کہ اس وقت برازیل کے جیل خانوں میں بند ہے۔ یہ قیدی نہ تو کسی وکیل سے مشورہ کر سکتے ہیں نہ اپنا مقدمہ تیار کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے ہیں۔ اور بالفرض محال ایسا کر بھی لیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ عدالتیں برازیلی حکومت کے ایما پر اپنا فیصلہ سناتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں اگر کسی عدالت کے روبرو پیش بھی کر دیا گیا تو بھی بیس اکیس برس کی قید بامشقت مقدر بنے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اہم شخصیات کو اغوا کر کے حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ چھاپہ ماروں کو رہا کرے۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے بعض اہم شخصیتیں معصوم ہوتی ہیں لیکن ہم ان کے اغوا کو غیر اخلاقی تصور نہیں کرتے۔ آخر حکومت بھی تو معصوم افراد کو اپنے ظلم کا نشانہ بناتی ہے۔ بقول قائد چارلس لا ماریگا ”ایک سفیر جو کہ آمر وقت کے ساتھ رہتا ہے، وہ ہمارے ساتھ بھی تین دن گزار سکتا ہے۔“

ہم نے یہ بات بھی محسوس کی ہے کہ اس قسم کی واردات کے ساتھ سینکڑوں غیر متعلق افراد بھی اپنے آپ کو ملوث کرتے ہیں۔ مثلاً ہم نے جب امریکی سفیر کو اغوا کیا اور پولیس نے ان کا پتہ چلانے کے لئے بھاگ دوڑ شروع

ہم کارخانہ داروں کو اغوار کر کے انہیں ملازمین کے مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں

...رہوں منٹ ہوتے ہیں !

کی تو اسے سینکڑوں گم نام افراد کے ٹیلی فون موصول ہوئے۔ سفیر موصوف یہاں ہیں۔ یہاں ہیں ــــ یہاں ــــ اور جب ہماری شرط کو منظور کرتے ہوئے ریڈیو پر اعلان کیا تو سینکڑوں افراد ٹرانزسسٹر لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ کیا یہ ایک قسم کا مظاہرہ نہ تھا۔

• سوال : آپ جو ہتھیار استعمال کرتے ہیں وہ زیادہ تر سرکاری فوجیوں سے چھین کر حاصل کئے گئے ہیں۔ یہ آپ کس طرح کرتے ہیں ؟

• ڈوبر : میں آپ کو سرکاری فوجیوں کی ایک بیرک پر چھاپہ ماروں کے حملہ کا واقعہ سناتا ہوں۔ اس میں میں بھی شریک تھا۔ ہماری ٹولی دس افراد پر مشتمل تھی۔ اور ہم سب سنتریوں کا روپ دھارے ہوئے تھے۔ رات کے تقریباً دس بجے ہم بیرک پہنچے، اور ہم نے ظاہر کیا کہ یہاں ہم فوجیوں کی دلچسپی کے لئے لڑکی تلاش کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ میرے ساتھی بہ آسانی بیرک میں داخل ہو گئے۔ اور میں بیرک کے باہر ڈیوٹی دیتا رہا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ واکی۔ ٹاکی کے ذریعے باہر کی صورت حال سے اندر گئے ہوئے ساتھیوں کو مطلع رکھوں۔ ہم خطرہ مول لینے کے قائل ہیں۔ ہمارے پاس کافی اسلحہ ہے۔ اس چھاپہ میں ہمیں دو کاربین، ایک چھوٹا ٹرک ہاتھ آیا۔ جس پر ہم نے بغیر کسی مداخلت کے قبضہ جما لیا۔ فوجی غفلت میں مبتلا رہے۔ اور ہم نے چند منٹوں میں رائفلوں، ہینڈ گرنیڈ اور دیگر فوجی ساماں بٹور لیا۔ اور فوجی چپ تماشا دیکھتے رہے۔ وہ اس بات پر خوش تھے کہ ہم انہیں گولی نہیں مار رہے۔ حکومت نے ہمارے بارے میں کچھ اس قسم کا پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ ہمیں آدمیوں کے خون بہانے میں بڑا لطف ملتا ہے۔ میرے ساتھی ابھی بیرک کے اندر تھے کہ میں نے دیکھا سامنے سے کچھ فوجی پولیس کے جوان چلے آ رہے ہیں۔ میں نے واکی۔ ٹاکی کی مدد سے ساتھیوں کو صورت حالات سے آگاہ کیا۔ اور فوجی پولیس کے جوان جونہی اندر داخل ہوئے قیدی بنا لئے گئے۔

ہم نے ایسی وارداتیں بہت ہی کم کی ہوں گی جس میں پولیس کی گاڑیوں نے ہمیں نہ دیکھا ہو۔ پولیس کی گاڑیاں ہمیں دیکھتی ہیں۔ مگر موت کے خوف سے مداخلت نہیں کرتیں۔ یہ بیچاری حکام کو اس کی اطلاع بھی نہیں دے سکتیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ایسا کرنے کے بعد ان سے جواب طلب کئے جائیں گے۔ افسران پوچھیں گے کہ انہوں نے مداخلت کیوں نہیں کی۔ خاموش تماشائی کیوں بنے رہے۔ اس واردات کو مکمل کرنے میں ہمیں بمشکل تیس منٹ لگے ہوں گے۔

• سوال : آپ اپنے اقدامات کی تیاری کس طرح کرتے ہیں ؟

• ڈوبر : ہمارے اقدامات عموماً بہت ہی سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ لیکن ہم انہیں بڑی توجہ کے ساتھ تیار کرتے ہیں۔ کسی قدم کو اٹھانے سے پہلے ہم اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ اور اس غور و خوض میں دو تین ہفتے لگ جاتے ہیں۔ ہم اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے ہر ساتھی کو پولیس والوں کے کردار اور اعمال کا پورا پورا شعور ہونا چاہیئے۔ ہم اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ہمیں گولی نہ چلانی پڑے۔ ہم اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ میں نے اب تک صرف ایک موقع پر گولی چلائی ہے۔

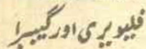
• سوال : یہ واقعہ کس طرح پیش آیا ؟

• ڈوبر : ہوا یہ کہ پولیس نے ایک لڑکی کو بری طرح زد و کوب کیا اور اس سے میری جائے رہائش کا پتہ حاصل کر لیا۔ چنانچہ سادہ لباس والوں کی ایک پولیس ٹولی میری جائے رہائش پر پہنچی اور پیچھے کی طرف سے حملہ کر کے مجھے دبوچ لیا۔ میرے پاس خود کار پستول موجود تھا میں نے گرتے گرتے ایک فائر کیا جو خطا کر گیا۔ میں نے دوسری مرتبہ لبلبی دبانے کی کوشش کی مگر پستول نہ چل سکا اور میں گرفتار ہو گیا۔

• سوال : آپ دیہی علاقوں کو چھاپہ ماری کے لئے موزوں کیوں سمجھتے ہیں ؟

• پیینوڈی : چھاپہ ماری کا آغاز ہم نے شہری علاقوں میں کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دیہی علاقوں میں چھاپہ مار سرگرمیاں شروع کرنے کے لئے ضروری مقدار میں ہتھیار اور رقم حاصل کی جائے۔ کیونکہ ان کے بغیر چھاپہ ماری ممکن نہیں۔ اور ۶۹-۱۹۶۸ء میں جب ہم نے دیہی علاقوں میں چھاپہ ماری شروع کی تو ہمیں معلوم ہوا کہ دیہی چھاپہ ماری کا اپنا ایک مقام ہے۔ اور یہ چھاپہ ماری مزدور طبقہ اور طالب علموں کو متاثر کر رہی ہے۔

مزدوروں کی حمایت میں چھاپہ ماری کرتے وقت ہمارے پیش نظر مزدوروں کے فوری مطالبات ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۸ء میں جب بیلو ہو ری زانٹے کی معدنی صنعتوں سے تعلق رکھنے والے مزدوروں اور بینک کے ملازمین نے ہڑتال کی۔ اور پولیس نے ہڑتالیوں پر گولیاں برسانی شروع کیں تو ہم نے شہر کے ایک بینک پر چھاپہ مارا اور پمفلٹ کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ اقدام ملازمین پر افسران کی طرف سے ہونے والی زیادتیوں کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ نیز اس طرح ہم نے ملازمین کو یہ راہ بھی دکھائی کہ مسائل کا حل کا زیادہ موثر طریقہ چھاپہ ماری ہے۔ ہم نے بنک کے اندر داخل ہوتے ہی چالیس افراد پر مشتمل بنک کے عملہ کو لاچار کر دیا اور ساری رقم قبضہ میں کر لی۔



فلیوبری اور گیبرا

• سوال : آپ اپنے عمل کو کس طرح تولتے ہیں ؟

• ڈوبر : ہم اپنے اقدامات کو اس کلیہ کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں کہ ہمارے کسی اقدام کو حکومت غلط معنی نہ پہنا سکے۔ ہم بڑے بازاروں، بالخصوص امریکن بڑے بازاروں پر حملہ کرتے ہیں اور خورد و نوش کی اشیا ر لوٹ کر پسماندہ علاقوں کے شہریوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ہمارے ان اقدامات سے ان کی مفلسی دور ہوتی ہے۔ ہم نے اس طرح بھی کیا ہے کہ کسی بڑی امریکن فوڈ انڈسٹری کے خورد و نوش سے لدے ہوئے ٹرک کی چوری کر لی۔ اور اسے کسی پسماندہ علاقہ میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ اور اس پر امریکیوں کے لئے اس نعرہ کو لکھ دیا "امریکہ کے لئے برازیل کی تمام اچھی چیزیں برازیلیوں کے لئے بھی اچھی ہیں" پسماندہ علاقوں کے باسی اس مذاق کو خوب سمجھتے ہیں۔

کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہم اس بنیادی اصول کو اپنے سامنے رکھتے ہیں کہ ہمارے کسی اقدام سے بھی عوام کو دکھ پہنچنے کی بجائے فائدہ پہنچے۔ ہم بتدریج ان کی تائید و حمایت حاصل

ہم عوام کی تائید وحمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو اپنا مخالف نہیں بنانا چاہتے

کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو اپنا مخالف بنانا نہیں چاہتے۔ چنانچہ ہم ایسا قدم اٹھاتے ہیں جس سے عوام خوش ہوں۔ مثلاً اگر کوئی کارخانہ دار اپنے ملازمین کی تنخواہ روک لیتا ہے تو ہم اس کارخانہ دار کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وہ ہمارے ہتھے چڑھ جائے تو اسے اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ ملازمین کو ان کی تنخواہ فوری طور پر ادا کرے۔ اب آپ ہی بتائیں اس قسم کے اقدام کو حکومت غلط معنی کیسے دے سکتی ہے؟ اگر ہم نے کسی شخص کو قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کیا تو کون سی بری بات کی۔ لوگوں کو کھانا بہم پہنچانے والے گروہ کو عوام اپنا دشمن کیونکر سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس فوج اور پولیس ہے کہ ان پر گولیاں چلا کر اپنا مخالف بنا لیتی ہے۔

بالخصوص پسماندہ علاقوں کے عوام تو ہماری پوری طرح حمایت کرتے ہیں۔ اگر کوئی چھاپہ مار پولیس سے پیچھا چھڑانے کے لئے پسماندہ علاقہ میں چلا جاتے تو غریب عوام اسے اپنی پناہ میں لے لیتے ہیں۔ اور پولیس کی پوچھ گچھ کا جواب نہیں دیتے۔ بعض اوقات اس طرح کا واقعہ بھی پیش آیا ہے کہ عوام کو ہماری کسی کارروائی کا پتہ چل گیا ہے۔ لیکن وہ دور کھڑے اس کا تماشہ دیکھتے رہے۔ انہوں نے تو کبھی کوئی مداخلت کی ہے اور نہ پولیس کو اطلاع دی ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے جب پہلی مرتبہ بنک لوٹا تو لوگ ہمارے اس اقدام سے واقف ہوگئے۔ اور بنک کے سامنے مجمع لگ گیا۔ اس پورے مجمع میں صرف ایک آدمی ایسا تھا جس نے پولیس کو اطلاع دینے کی جرأت کی۔ مگر کاؤنٹر مین نے اسے فون استعمال کرنے کی اجازت نہ دی۔ کاؤنٹر مین نے اس آدمی کو جواب دیا تھا "یہ دولت میری ہے۔"

• **سوال:** کیا آپ بم استعمال کرتے ہیں؟

• **ڈوبو:** ہم ایسے ہتھیاروں کا استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں، حکومت جنہیں ہمیں بدنام کرنے کے لئے استعمال کر سکے۔ اگر ہم بم کا استعمال کریں تو ہماری حکومت امریکیوں کی سی حرکت کرے گی۔ وہ کسی سینما گھر میں یا بچوں سے بھرے ہوئے پارک میں بم رکھ دے گی اور پھر اس کے بعد ہم آگے کی طرف بھاگ رہے ہوں گے اور عوام ہمارا پیچھا کر رہے ہوں گے۔

• **سوال:** آپ بنک کیوں لوٹتے ہیں؟

• **ڈوبو:** ہم جب بنک لوٹتے ہیں تو اپنے اس اقدام کو "روپے کی واپسی" کا نام دیتے ہیں۔ اور عوام کو یہ باور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موجودہ بنکاری عوام کے مفادات کو پورا نہیں کرتی۔ یہ تو ایک ذریعہ ہے جس سے بڑے بڑے سرمایہ دار عوام سے روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر اس روپے سے پولیس اور فوج پالتے ہیں۔ جس کا کام مظاہرین اور ہڑتالیوں پر گولی چلانا ہے۔ بنک کے علاوہ ہم ان جرنیلوں اور حکومتی افسروں کو بھی لوٹتے ہیں جن کو امریکی سامراج کی طرف سے بھاری رقم ملتی ہے۔ اور وہ اس قدر بے ایمان ہیں کہ یہ رقم بنکوں میں رکھنے کی بجائے اپنے اپنے گھروں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک واردات میں ہمیں ۲۵ لاکھ ڈالر کی رقم ملی۔ لاطینی امریکہ کی تاریخ میں شاید یہ

بنکوں سے سرمایہ دار عوام کا روپیہ حاصل کرتے ہیں اور اس روپے سے مظاہرین اور ہڑتالیوں پر گولی چلانے کے لئے پولیس اور فوج پالتے ہیں۔

سب سے بڑی ڈکیتی تھی۔ مگر چونکہ یہ ایک ناجائز رقم تھی اور اس کے حصول میں بڑے بڑے سرکاری افسروں کے ہاتھ تھے اس لئے ڈکیتی کی خبر کو چھ مہینے تک دبائے رکھا گیا۔ لیکن ڈکیتی کی افواہ جب جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تو حکومت کو اس کا اقرار کرنا پڑا۔ اس افواہ کو پھیلانے کے لئے ہمیں خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔ اور وہ سیف جس میں رقم رکھی گئی تھی اسے باہر نکالنا پڑا تھا۔ اس سیف کا وزن تقریباً ۲۵۰ کیلوواٹ تھا

• **سوال:** سنا ہے آپ کی تنظیم کے زیادہ تر افراد زیر زمین رہتے ہیں؟

• **گیبیوا:** ہاں یہ درست ہے وہ افراد پولیس کو جن کی تلاش ہوتی ہے زیر زمین زندگی گزارتے ہیں۔ اور وہ ملازمت وغیرہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پہچانے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ برازیل کے مشہور انقلابی رہنما چارلس چار لامیریکا ان دونوں زیر زمین ہیں اور برازیلی حکومت انہیں کھوج نکالنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ہمارے بہت سے ساتھی جن کی پولیس کو تلاش ہے، نام اور بھیس بدل کر نارمل زندگی گزار رہے ہیں۔

• **سوال:** حکومت اس بات کی بھی کوشش کرتی ہوگی کہ چھاپہ مار تنظیموں میں اپنے ایجنٹ داخل کر دے؟

• **ڈوبو:** پہلی بات تو یہ کہ ہم انہی افراد کو اپنی تنظیموں کا رکن بناتے ہیں جنہیں تنظیم کے اکثر افراد کئی سال سے جانتے ہوں۔ ہم خطرہ مول لینے کے قائل نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ برازیلی حکومت نے آٹھ سو آدمیوں کو چھاپہ مار تنظیموں میں گھسنے کی تربیت دی ہے۔ لیکن ابھی تک ہماری تنظیم میں کوئی مخبر نہیں گھس سکا۔ البتہ ہمارے کئی مخبر سرکاری محکموں اور دفاتر میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ فوج، پولیس اور جاسوسی کے محکموں میں کام کرنے والے بہت سے ملازمین موجودہ حکومت سے بیزار ہیں اور چھاپہ ماروں کے لئے اپنے دلوں میں دوستانہ جذبات رکھتے ہیں۔

• **گیبیوا:** ہماری تنظیموں کی رکنیت حاصل کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے افراد کو ایک طویل امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم رکنیت کے خواہشمند ایک فرد کو کسی چھوٹی سی مہم پر روانہ کر دیتے ہیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس مہم کو کیسے سر کرتا ہے۔ بعض کیس ایسے بھی ہیں جن میں کہ ہم تنظیم کی ممبری کے متمنی افراد کو ایک طویل عرصہ کے لئے کسی مہم پر روانہ کر دیتے ہیں اور اس سے کسی قسم کا بھی رابطہ نہیں رکھتے۔

• **سوال:** گذشتہ سے پیوستہ سال جب پولیس کے ہاتھوں چارلس ماریگھیلا شہید ہوئے تو یہ افواہ اڑی تھی کہ ماریگھیلا ڈومنیکن کی غداری کی وجہ سے مارے گئے، یہ بات کہاں تک درست ہے؟

• **فلیبوبوی:** یہ الزام بالکل غلط ہے۔ اس افواہ کو حکومتی حلقوں کی طرف سے پھیلایا گیا تھا۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ چھاپہ مار تنظیموں کو ڈومینکی کلیسا کی طرف سے بدظن کیا جائے۔ ڈومینکی کلیسا بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ماریگھیلا کے لئے زیر زمین جانا بڑا ہی مشکل تھا۔ ماریگھیلا بہت ہی لمبا، بھاری بھرکم اور گہری رنگت کا آدمی تھا ایسا کہ دور ہی سے پہچان لیا جائے۔ وہ ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ پولیس نے اسے پہچان لیا۔ ماریگھیلا اور پولیس کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ ماریگھیلا کا نشانہ خطا کر گیا اور پولیس کی گولی ماریگھیلا کو لگ گئی۔

• **سوال:** مشہور ہے کہ برازیل نے پرتگالیوں سے آزادی حاصل کی، ملک میں غلامی کے رواج کا خاتمہ کیا۔ اور شہنشاہیت کا خاتمہ کیا۔ لیکن اس سارے عمل کے دوران خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہا۔ وہ کون سی چیز تھی جس نے آپ کو جدوجہد کے پرامن طریقہ کار کو ترک کرنے پر مجبور کیا؟

• **ڈوبو:** ۱۹۶۹ء سے پہلے ہم پرامن طریقہ کار کو اختیار کئے ہوئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم اس طریقہ کار کے ذریعہ امیری اور غریبی کا فرق مٹا دینے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طبقات نے ہم پر فوجی آمریت مسلط کر کے اور امریکی سامراج سے گٹھ جوڑ کر کے ہمیں ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

(باقی آئندہ)

اِک طرفہ تماشہ ہے....

پروفیسر عتیق احمد

سیاست اور صحافت کھال کھینچنے اور جمع کرنے کا نام ہے

۷ ، اور ۱۷ ، دسمبر ۷۰ء آئے اور گزر گئے" اور ان کی گزرگاہ پاکستان سے ۱۲ کروڑ عوام کے لئے آس اور امیدوں کی روشن لکیر بن گئی۔

پھر ۱۵ ، اور ۱۶ ، فروری ۷۱ء آئے اور وہ بھی گزر گئے۔ مگر ان کی گزرگاہ ۷ ، اور ۱۷ ، دسمبر کی روشن لکیر پر ناامیدی اور مایوسیوں کی سیاہی پھیرتی چلی گئی۔ پھر اس سیاہی میں مشرقی پاکستانیوں کا سرخ رنگ ملا اور اس سیاہی اور سرخی نے مل کر اب اس جمہوریت کا چہرہ بھیانک بنا دیا ہے جس جمہوریت کی ایک جھلک کے لئے پاکستان کے عوام برس ہا برس سے ترس رہے تھے۔ اور اب جو کچھ ہونے والا ہے اور جمہوریت کا استقبال جس طور بھی ہوگا اس کا تصور کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہے ہر طرف ایک مہیب سناٹا ہے۔

یہ سناٹا اچانک طاری نہیں ہوا ہے۔ اس کا اپنا ایک پس منظر بھی ہے جس کی نشان دہی ۱۵ ، اور ۱۶ ، فروری کے دنوں سے ہوتی ہے۔ کہ جب بھٹو کی ڈھاکہ سے واپسی کے بعد شیخ مجیب کا یہ بیان آیا کہ پاکستان کا آئندہ دستور صرف اور صرف چھ نکات پہ بنے گا اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ادھر بھٹو صاحب نے اس غزل کا جواب دیا کہ چھ نکات پہ مبنی دستور پورے ملک کی دستوری ضروریات کو پورا نہیں کر سکے گا ان میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور اس کے بعد — چراغوں کی لو مدھم ہوتی گئی اور تاریکی اور سناٹے یہ منزل آگئی کہ اب جیسے دم کا درد دورہ ہے اور بس۔

لیکن اس صورت حال کی ذمہ داری صرف مجیب اور بھٹو پر ہی نہیں اس کے پس پشت اور بھی بہت سے عوامل کام کر رہے ہیں مثلاً یہ بات زبان زد عام ہے کہ امریکہ بہادر بھی اس معاملے میں اپنا روایتی کردار ادا کر رہا ہے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں کہیں "مظلوم اور پسماندہ" عوام کے حقوق آزادی کا مسئلہ ہو اور یہ "بی جمالو" چپ رہ جائیں۔ د مجیب صاحب نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا یہی مقدمہ بنایا ہے کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی نو آبادی بن کر رہ گیا ہے اور ہمیں اپنے عوام کو ان "مغربی آقاؤں" سے آزاد کرانا ہے۔ دوسری طرف ہمارے مغربی پاکستان کے وہ شکست خوردہ سیاست دان ہیں جو کسی طور بھی اپنی دو دو چار چار نشستوں پہ قانع ہوتے نظر نہیں آتے اور پیپلز پارٹی کی ترا سی ۸۳ نشستیں ان کے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہیں۔ تیسری طرف شاطر سرمایہ دار، چوتھی طرف عیار نوکر شاہی ہے اور ان سب کے بیچوں بیچ ایک شکست خوردہ سیاسی جماعت کا پشت پناہ "پسندہ" ٹائپ مقبوضہ پریس ہے جس میں "نام نہین سکھ" نوع کے دانشوروں کی ایک فوج ظفر موج ہے۔ جو چاروں انتشار پسند قوتوں کے مفاد کی کہیں دانستہ اور کہیں نا دانستہ ترجمانی کر رہی ہے اور فائدہ سب کو یکساں طور پہ پہنچ رہا ہے۔ بات بالکل صاف ہے کہ جہاں مفادات کی نوعیت ایک ہو وہاں کسی ضابطہ گٹھ جوڑ کی ضرورت نہیں ہوتی مگر ذہنی اور عملی طور پر ہم آہنگی اس بنا پر وجود میں آجاتی ہے کہ مفاد سب کا مشترکہ طور پر ایک ہی سمت میں متعین ہوتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں مشترکہ مفاد یہ تھا کہ ملک میں افراتفری کو اس درجہ تک پہنچا دیا جائے کہ ملک کی پوری سیاست صرف نظم و نسق کے مسائل تک آ کر محدود ہو جائے اور لوگوں کو اپنے اس قول کی صداقت کا یقین دلا دیا جائے کہ مجیب اور بھٹو کی پارٹیوں کو منتخب کر کے لوگوں نے اپنی بے شعوری کا ثبوت دیا ہے۔

انتخابات سے لے کر اب تک کے ان "پسندہ" ٹائپ "مقبوضہ" اخبارات، رسائل اور ہفت روزہ میں سے کسی ایک کو اٹھا لیجیے ان کے صفحات پر صرف اور صرف ایک ہی دکھ بھری کہانیوں سو سو پیرائیوں میں لکھی ہوئی ملے گی کہ ہائے ہائے بھٹو کو لوگوں نے اپنی بے شعوری کے تحت قوم کا لیڈر بنا دیا۔ لوگوں! تم نے ہمیں لوٹ لیا، تباہ کر دیا۔ ہائے نادانوں! تم نے پاکستان اور عالم اسلام کے واحد اسلامی قلعہ "اچھرہ شریف" کے، ذیلدار" پارک شریف" کو ڈھا دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر ایک خدا داد موقع از خود انھیں مل گیا۔ گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ گرا۔ وہ چھریاں جو آہستہ آہستہ نیفوں میں اڑسی جا رہی تھیں پھر سے "ان بھٹو پوسٹ مارٹم ایکسپرٹس" کے ہاتھوں میں آ گئیں۔ سب وہی بھٹو ہیں، اسلام پسندی کی چھریاں ہیں اور میدان سیاست کی کارزاریاں ہیں۔ عید قرباں کا سماں ہے کہ گلی گلی مارو کاٹو والی سیاست لے کر بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھنے والے کبوتران حرم تک رسیاں اور چھریاں لئے بھاگ رہے ہیں۔ بھٹو آمریت پسند ہیں — بھٹو نے محض اپنے اقتدار کی خاطر قوم کو سیاسی بحران میں ڈال دیا ہے۔ بھٹو امریکی ایجنٹ ہیں — بھٹو سے جان چھڑاؤ۔ بھٹو کی ضد نے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی راہ پر ڈال دیا۔ پیپلز پارٹی کے دماغ میں تشدد پسندی کا خناس گھس گیا ہے۔ غرض ساری سیاست اور صحافت گویا کھال کھینچنے اور کھال جمع کرنے کی مہم ہی کا ایک حصہ ہے تاکہ خدمت خلق میں مصروف جہاد گشتی شفاخانے کا کاروبار بھی چلے اور اپنے "نام نہین سکھوں" کی "ایوان" کی روٹی پانی کا دھندہ بھی "چالو" رہے۔ رہا ملک، اس کی سلامتی، یک جہتی، اسلام کی سربلندی اور عوام کی خوشحالی کے مسائل تو اول تو "کبوتران حرم" پارٹی سے لے کر کھال کھینچ پارٹی تک کے لئے ان مسائل کا سنجیدگی سے کوئی وجود ہی نہیں ہے اور جو ہے سو اتنا کہ بس زبانی، جمع خرچ کے تحت بیانوں اور تقریروں کے اندراج رجسٹروں میں ہوتے رہیں اور سال کے سال آمد اور خرچ کے من مانے گوشوارے انٹ شنٹ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیئے جائیں آگے آیت۔

بہرحال اس سیاست اور صحافت کا محور اور مرکز ابھی تک ان منتقمانہ جذبات سے علاوہ نہیں ہو سکا ہے جن کے گرد ان کی گردش یکم جنوری شکست سے شروع ہوئی تھی۔ حالات کچھ بھی ہوں۔ واقعات کا رخ کچھ ہی نشان دہی کر رہا ہو سیاست کے تقاضے کتنے ہی بدل جائیں۔ عقل و فہم کے استعمال کے کتنے ہی مواقع میسر کیوں نہ ہوں" دید و دانش کے لئے کتنے ہی در کھل جائیں۔ مقبوضہ صحافت کے ان کولھو کے بیلوں کے آنکھوں پر چڑھی ہوئی اندھیری ان کو کچھ نہیں دیکھنے دیتی۔ یہ اس چکر میں مگن ہیں جو زمین کے دائرے میں ان کے لئے اسلام پسندی کے نام پر تیل نکلوانے کے لئے کھینچ دیا گیا ہے۔

زیادہ دور جانے کی زحمت کیوں کیجیے۔ مقبوضہ اخبارات کے لب و لہجہ کو اور اس کی پس پشت پر ڈوری ہلانے والی "پسندہ" برانڈ سیاست کے نائیفوں کی عقل و دانش کے مظاہروں سے لطف لیجئے۔ ۵ مارچ کے "جسارت" (کراچی) ہی کو دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ کس "خوب صورتی" کے ساتھ موجودہ تعطل کو صرف اور محض بھٹو کے سر منڈھ کر کھالوں کے بیت المال سے ملنے والی ماہ بماہ رقم کو اپنے اوپر حلال کیا گیا ہے۔ ذرا اس سیاسی عقل و دانش کا معیار دیکھیے جو دستور کے موجودہ تعطل کو اس نگاہوں سے دیکھتی ہے کہ "موجودہ جھگڑے کا اصل پس منظر دیکھا جائے تو وہ فقط پنجاب اور بنگال کا جھگڑا ہے"۔ سبحان اللہ کیا قومی اور اسلامی نقطہ نظر ہے کہ جس سے قوم کی یک جہتی، اور رواداری اور بھائی چارے کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا چشمہ بہہ رہا ہے۔ نقطہ نظر کیا

رجعت پسند خیالی دشمنوں سے برسرپیکار ہیں

ہے یہ توگویا "قومی تعمیرِ نو" کا وہ ادارہ ہے جس کے جوہر تو اس وقت کھلے ہوتے کہ اگر وہ تمام پرانے سیاست دان جو پنجاب اور بنگال میں تصادم کے بجائے دونوں علاقوں میں مفاہمت کے حامی تھے" (جیسے مفاہمت کے یہ حامی کبھی پہلے برسرِ اقتدار تھے ہی نہیں)۔ اب بنگال اور پنجاب کے اس جھگڑے کی وجہہ بھی سن لیجیے۔ "مسٹر بھٹو نے بڑی عیاری اور ہوشیاری کے ساتھ بنگال کے مقابلے میں پنجابیت کی رگ کو ابھارا اور پنجاب کو فریق بناکر بنگال کے مقابلے پر لے آئے ..... مسٹر بھٹو نے پنجاب میں بنگال کی عداوت کے جذبے کا سہارا لیا اور ہیرو بن گئے لیکن جذبۂ عداوت کا یہ چیمپین جب مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو کیا مغربی پاکستان تنہا باقی رہ سکے گا؟ اور کیا پاکستان کی اس تباہی میں خود پنجاب کی تباہی مضمر نہیں ہے؟" ـــــ لہٰذا "مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے تمام جمہوریت پسندوں کو خواہ ان کا تعلق دائیں بازو سے ہو یا بائیں بازو سے مسٹر بھٹو کے مخالف پاکستان اور مخالف جمہوریت عزائم سے نمٹنے کے لئے متحد ہو جانا چاہیئے" ـــــ ایسا نہ ہوا اور مسٹر بھٹو کو اپنا کھیل کھیلنے کا موقع دیا گیا تو وہ نہ صرف مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کریں گے بلکہ مغربی پاکستان کو شتر بےمہار کی طرح توڑ پھوڑ دیں گے۔ دیکھا آپ نے کہ تیلی کا کھینچا ہوا دائرہ اور آنکھوں پر چڑھائی ہوئی اندھیری بیچارے بیلوں کو کیا بنا دیتی ہے؟ بس ناک کی سیدھ میں گھومے جاؤ اور اندھیری کی درازوں میں سے جو نظر آتا ہے اسے دیکھو۔ یہی اپنی دنیا جالو اور پہننے کے پہنے موٹی موٹی رقمیں جیبوں میں ڈالتے رہو۔ اور اس بات کو کون نہیں جانتا کہ کسی ایک ہی چیز کو آدمی جب کمزوری بنا لیتا ہے تو باقی دوسری تمام چیزوں سے بغض للّٰہی ہو جاتا ہے اور وہ اپنا یہ بغض پھر دوسروں میں منتقل کرنے کی کوشش ہے۔ ایک "جسارت" اور اس کے مندرجات ہی پر کیا منحصر ہے۔ اس قبیل کے جس مقبوضہ اخبار اور رسالے کو اٹھا کو اٹھا لیجئے وحدت کی یہی کثرت اور کثرت میں یہی وحدت جلوہ گر ملے گی۔ ایک مثال اور ایک مثالی اسلام پسند ہفت روزہ سے دیکھ لیجیے۔ موضوع یہی دستوری تعطل ہے۔

پیپلز پارٹی کا معاملہ عوامی لیگ سے مختلف ہے۔ اس کے پاس کوئی نکات نہیں تھے ..... اس کا انتخابی حربہ یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام ظلم و استحصال کے مارے ہوئے لوگوں کو پرفریب وعدوں کے جال میں پھنسا کر ان کی رائے حاصل کی جائے اور اس کے بل بوتے پر اقتدار سے جدائی کے مرحلوں کو ناپا جائے (ایشیا) ـــــ اس ہی ہفت روزہ کے اس ہی شمارے میں اسلامی تہذیب اور رواداری کے ان پرچارکوں کے یہ جواہر ریزے بھی ملیں گے۔ "پیپلز پارٹی کے دماغ میں تشدد پسندی اور غنڈہ گردی کا خناس گھس گیا ہے"۔ "ان لوگوں کی خوش فہمی کا بھانڈا" پھوٹ گیا، جو پیپلز پارٹی کی کامیابی کے بعد اس کے دماغی توازن کے بارے میں لگائے بیٹھے تھے"۔ "انتخابات میں کامیابی کے بعد پیپلز پارٹی کا فتور دور ہو جائے گا" وغیرہ وغیرہ۔ اس "مقبوضہ صحافت" کے یہ انداز صاف

"کبوتران حرم پارٹی" ذہنی دیوالیہ پن کا شکار ہو گئی ہے

صاف چغلی کھاتے ہیں کہ ان کے نزدیک قوم اور ملک کی فلاح و بہبود کے سارے راستے صرف اور محض پیپلز پارٹی سے انتقام شکست کی آرزو سے گزرتے ہیں۔ یہ بڑی تنگدلی کا راستہ ہے۔ بغض اور کینے کے گرد گھومنے والا کوئی جذبہ، کوئی خیال اور کوئی عمل مثبت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ بات سامنے کی ہے کہ اس پوری سیاست اور صحافت کا انداز نفی پسندی پر مرتکز ہو کر رہ گیا ہے۔ جو اپنی آخری منزل پیپلز پارٹی کی تضحیک اور تذلیل سمجھتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہی ایک پارٹی تب مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں کامیاب ہونے والی دوسری سیاسی پارٹیوں کے مقابلے میں سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری ہے۔ اور اس اعتبار سے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کے مفادات کی نگرانی کا محور مشرقی پاکستان میں مکمل شکست کھا کر بھی دوسری بڑی پارٹی بن کر ابھرنے والی دعویدار جماعت کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اپنی کشتیاں جلا کر اس "دوسری بڑی پارٹی" کی حمایت میں نکلنے والے دانشوروں، ادیبوں، اور صحافیوں کے روزی روزگار کا مسئلہ اور بے کاری کا مرحلہ انہیں بڑے بھیانک خواب دکھا رہا ہے۔

اور اس اعتبار سے اس مقبوضہ صحافت کے کارکنوں، اداریہ نویسوں، تجزیہ نگاروں اور اس کے بل پر روپیہ کمانے والے مالکان اخبار و رسائل پر بڑا برا وقت آن پڑا ہے مگر ردِ بلا کا جو وظیفہ "انتین سکھوں" نے جپنا شروع کیا ہے، اس کے نتائج اور اثرات اگرچہ ان کی روزی روزگار کے سلسلے میں وقتی طور پر ان کے مفید مطلب پڑ رہے ہیں۔ لیکن اس روش زہر آگیں سے یاس اور ناامیدی، افراتفری اور ذہنی کج روی کے جو جراثیم عوام کے دل و دماغ کے اندر سرایت کر رہے ہیں۔ شاید انہیں ابھی خود بھی ان کے آخری نتائج کی کوئی تشکل بنتی نظر نہیں آ رہی ہے۔ مایوس دل اور کج رو ذہن سلامتی ملک کا سب سے کمزور دفاعی مورچہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سوچنے کی یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ پیپلز پارٹی ابھی کون سی برسرِاقتدار آگئی ہے کہ خواہی نخواہی ان حضرات کو آزادیٔ تقریر و تحریر کی "روشن روایات" کو نباہنا ہی ہے۔ اس بات کا تذکرہ اس لئے بھی ضروری ہے محسوس ہو رہا ہے کہ ان حضرات کی ایک دلیل پیپلز پارٹی اور بھٹو کی مخالفت کی یہ بھی ہے کہ صاحب اگر پریس ہی سیاسی لیڈروں کو نہیں ٹوکے گا تو پھر کیا فرشتے اس کام کو کریں گے۔ جبکہ یہ منطق اپنے بنیادی مفروضے ہی سے غلط انداز اور کج فہمی پر استوار ہے پیپلز پارٹی کے منشور سے اختلاف کی ساری بھڑاس ہر جائز اور ناجائز طریقے پر اس مقبوضہ پریس نے انتخابات کے دوران نکال لی تھی۔ بعدِ انتخاب کی اب جو کارروائیاں اس ضمن میں اسلام پسندی کے مقبوضہ اخبارات و رسائل میں آج کل ہو رہی ہیں اب اس کو کیا کہیے؟ اگر غصہ اس بات پر ہے کہ یہ پارٹی کیوں جیتی؟ تو اس خدائی فوجداری کے تو وہی نتائج مرتب ہوں گے جن کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا جا چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ پیپلز پارٹی سرے سے تمام اختلافی مسائل سے بالاتر ہے یا اس کی کسی بات

کو کبھی بلا چیلنج گزرنے دیا جائے تو غالباً ہی نہیں یقیناً اس خواہش کا اظہار نہ کبھی اس پارٹی کے اندر سے کسی نے کیا ہے اور نہ باہر ہی کوئی اس حماقت کا ارتکاب کر سکتا ہے دراصل اس مذکورہ صحافت کا یہ ڈھڑا اس رجحان کا ذمہ دار ہے جو اس کی پشت پر دور بلا نوالی سیاست کا ہے، اور وہ یہ کہ مفروضے تراشو اور خیالی دشمن سے برسرپیکار ہو۔ اور اسی ہی کا دوسرا نام خدائی فوجدار بنتا ہے۔ اس مفروضہ تراشی کی ایک تازہ مثال حضرت انعام درانی کا دو ایک دن پہلے کا کالم موجود ہے جس میں صاحب موصوف نے اپنے کسی بچپن کے طالب علم ساتھی کی چغل خوری کر کے ہم سبق دوسرے بچوں کی پٹائی کرانے کا قصہ لکھا ہے۔ اور اس واقعہ یا قصے کو صدر مملکت کے اسمبلی کے اعلانِ التوا کو بھٹو صاحب کی صدر سے چغل خوری اور مشرقی پاکستانیوں کی "پٹائی" کا ذمہ دار بتایا ہے۔ نہ جانے اس مفروضہ تراشی کے شوق میں انعام درانی صاحب اپنا وہ کالم کیسے فراموش کر گئے جو انتخاب کے بعد دو ایک روز کے اندر اندر انہوں نے بھٹو صاحب کو کامیابی کی مبارکباد دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا اور جس میں بھٹو صاحب کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر رکھ دیئے تھے۔ خیر یوں تو اس صحافت کی عام روش کے پیش نظر انعام صاحب سے کیا کسی سے بھی کچھ کہنے کی گنجائش نہیں مگر پڑھنے والے کو اصل بات اور مفروضہ تراشی کے درمیان فرق کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہی کہ اب یہ فیصلہ کون کرے کہ انعام صاحب کا وہ مبارکبادی والا کالم مفروضہ تراشی کا کرشمہ تھا اور یہ دو ایک دن پہلے والا کالم ان کی حقیقت پسندی کا مظہر ہے۔ یا اس کا الٹ ہے۔ اور یوں بھی بحیثیت مجموعی "پنڈ" برانڈ صحافت اور سیاست بمع "تین سکھ" مارکہ دانشوروں کے یہ پوری کائنات وہ جامہ ہے کہ جس کا الٹا ہی الٹا ہے۔ اور اس کا سیدھا تلاش کرنے کی کوشش کیجئے گا تو اس سیاست اور صحافت کا معاملہ وہی کھلے گا جو حضرت اکبر الہ آبادی پر حقیقی اور مجازی شادی کے فرق کے سلسلے میں کھلا تھا۔

کہ یہ جامے سے باہر ہے،
وہ پاجامے سے باہر ہے۔

"ہمارے ادب اور فن کو لاکھوں اور کروڑوں محنت کش عوام کی خدمت کرنی چاہیئے"

گوسون

ترجمہ : نعیم آروی

رنتو

چینی افسانہ

سردی شباب پر تھی

میں سات سو میل کا طویل سفر طے کر کے اپنے پرانے گھر کو جا رہا تھا، میرا اپنا گھر جسے چھوڑے ہوئے تقریباً ۲۰ سال گذر چکے تھے۔

موسم سرما کے دن تھے۔ ہم جوں ہی اپنے گھر کے قریب پہنچے، سردی شدید ہوگئی۔ ٹھنڈی اور یخ بستہ ہوائیں ہماری بوٹ کے کیبن سے ٹکرا رہی تھیں۔ دُور اور نزدیک لمبے لمبے بانسوں میں گھرے کچے پکے مکانات نظر آرہے تھے۔ وسیع نیلگوں آسمان کے نیچے بعض گاؤں تنہا اور سنسان دکھائی دے رہے تھے۔ زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

"یقیناً یہ میرا وہ پرانا گھر نہیں ہو سکتا جو پچھلے بیس سالوں سے میرے خیالوں میں بسا ہُوا تھا۔" وہ گھر جو میرے خیالوں میں بسا ہُوا تھا۔ اس سے قطعی مختلف تھا۔ وہ زیادہ، بہت زیادہ بہتر تھا۔ لیکن، اگر مجھ سے کوئی میرے گھر کی خوبصورتی یا اس کی خوبیوں کی تفصیلات پوچھ بیٹھتا تو اس کی وضاحت میرے لئے ممکن نہ تھی۔ میرے پاس ایسے الفاظ نہیں کہ میں ٹھیک طور پر بیان کر دیتا۔ اور جب میں واپس اپنے گھر جا رہا تھا تو شدید مایوسی کا شکار ہو چکا تھا۔ میں نے فوری طور پر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے سوچا، گھر ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ محض میری اپنی سوچ کا دھوکا ہے۔

میرے اس سفر کا مقصد اپنے آبائی گاؤں کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہنا تھا۔ میرا پرانا گھر ایک دُوسرے آدمی کے ہاتھوں فروخت ہو چکا تھا۔ چند سال سے اس میں ایک نیا خاندان آباد تھا۔ چنانچہ سالِ نو سے پہلے پہلے میں اپنے پرانے پیارے گھر کو آخری بار دیکھنے کے بعد اسے خدا حافظ کہنا چاہتا تھا اور پھر اپنے خاندان کے ساتھ شہر روانہ ہونے والا تھا، جہاں میں برسرِ روزگار تھا۔

میں دُوسرے دن صبح کو اپنے گھر پہنچ گیا۔ میری ماں مجھے خوش آمدید کہنے کے لئے دروازے پر کھڑی تھی۔ میرا سات سالہ بھانجہ دروازے کے عقب سے دوڑتا ہُوا باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر ماں کے چہرے پر خوشی اور سوگواری کے ملے جُلے تاثرات پھیل گئے۔ ماں نے گھر چھوڑنے کے سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اور مجھے بٹھا کر چائے بنانے چلی گئی۔ میرے بھانجے نے مجھے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑا ٹکر ٹکر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

رات ہوئی تو میں نے اپنی ماں سے روانگی کے بارے میں گفتگو کی۔ گاؤں چھوڑنے کا دُکھ اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ شہر میں میں نے ایک مکان خرید لیا ہے۔ کچھ ضروری سامان کی خریداری بھی ہو گئی ہے۔ البتہ گھر کے لئے فرنیچر خریدنا ابھی باقی ہے، یہاں کا سامان بیچ کر ہم فرنیچر وغیرہ بھی آسانی سے خرید سکتے ہیں۔ ماں نے میرے پروگرام کی منظوری دیتے ہوئے بتایا کہ بھاری سامان کو پیک کیا جا چکا ہے۔ یہاں کا نصف فرنیچر بھی فروخت ہو چکا ہے۔ لوگوں پر کچھ پیسے باقی ہیں جو آجکل میں وصول ہو جائیں گے۔

ماں نے کہا "ایک دو دن آرام کر لو۔ رشتہ داروں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ پھر چلے چلیں گے"

"بالکل ٹھیک" ۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہارے جانے کے بعد رنتو یہاں آیا کرتا تھا۔ وہ اکثر تمہارے بارے میں پوچھا کرتا تھا۔ وہ تم سے ملنے کے لئے بڑا بے چین تھا۔ میں نے اُسے تمہاری آمد کی خبر دے دی تھی بس وہ کسی وقت بھی تم سے ملنے کے لئے یہاں آئے گا"

"رنتو" میری آنکھوں کے سامنے ایک لڑکے کی تصویر گھوم گئی۔ ۱۲ سال قبل جب اس سے میری ملاقات ہوئی تھی تو اس کی عمر تقریباً دس سال کی تھی۔ اس وقت میرے والد بقیدِ حیات تھے اور ہمارا شمار کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ میں سیدھے سبھاؤ کا ایک انتہائی شریف لڑکا تھا۔ ہمارے گھر میں کام کرنے کے لئے ایک جز وقتی ملازم تھا۔ رنتو، اسی کا لڑکا تھا۔ میرے والد کی رضامندی سے رنتو چھوٹے موٹے کام کے لئے ہمارے گھر آگیا۔ میں اس بات سے بے حد خوش ہُوا۔ رنتو کے بارے میں میں نے بہت کچھ سُن رکھا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ میرا ہم عمر تھا اور چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو پکڑنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔

رنتو سے میری پہلی ملاقات باورچی خانے میں ہُوئی۔ میری ماں نے بتایا کہ رنتو آگیا۔ میں دوڑتا ہُوا باورچی خانہ میں گھس گیا۔ اس کا چہرہ گول تھا۔ سر پر چھوٹی سی ٹوپی تھی۔ اس کے گلے میں چاندی کا لکلٹ پڑا ہُوا تھا۔ شروع میں وہ ہر شخص سے شرمایا شرمایا رہتا تھا اور جب کوئی نہ ہوتا تو مجھ سے گفتگو کرتا تھا۔ چند گھنٹوں کی ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے

رنتو شہر سے آیا تھا اور وہ اپنے ساتھ شہر کی نئی نئی باتیں لایا تھا۔ وہ گھنٹوں مجھے شہر کی باتیں مزے لے لے کر سنایا کرتا تھا۔ دوسرے دن میں نے اس سے چڑیا پکڑنے کی فرمائش کی۔ اس نے کہا، ابھی نہیں، یہ کام بھاری برفباری کے بعد کیا جاتا ہے"

ہم دونوں اکثر سمندر کے کنارے چلے جاتے۔ لہروں کے ریلے میں گھونگے اور سیپیاں ساحل پر پھیل جاتیں۔ سورج کی روشنی میں جگ مگ کرتیں، لہریں واپس چلی جاتیں تو ہم دونوں گیلی ریت پر دوڑتے چلے جاتے۔ ہمارے قدموں کے نشانات بنتے اور مٹ جاتے، واپسی میں ہم دونوں اپنے دامن میں رنگ برنگی سیپیاں چُن چُن کر بھر لیتے تھے۔ سمندر کی شور مچاتی لہریں جب ایک دوسرے پر گرتی پڑتیں، بھاگم بھاگ ساحل کی طرف لپکتیں تو رنتو چیخ کر کہتا:

"اب دیکھنا چھوٹی چھوٹی مچھلیاں، مینڈکوں کی طرح اپنا کرتب دکھائیں گی" اور پھر ہم دونوں ننھی منھی مچھلیوں کے کرتب پر جی کھول کر ہنستے تھے۔

چند ماہ کے بعد اچانک ایک دن معلوم ہُوا کہ رنتو شہر جانے والا ہے۔ میں یہ خبر سُن کر رونے لگا۔ اس نے بھی جانے سے انکار کیا مگر اس کا بابا اُسے شہر لے گیا۔ چند ہفتوں کے بعد جب وہ واپس آیا تو اُس نے مجھے ایک پیکٹ دیتے ہُوئے کہا۔ "رنتو نے آپ کے لئے تحفہ بھجوایا ہے" میں نے پیکٹ کھول کر دیکھا، اس میں رنگ برنگ کے گھونگے اور خوبصورت پروں کے گچھے تھے۔

ماں نے رنتو کا نام لیا تو میرے ذہن میں اچانک ماضی کے گزرے لمحات گھوم گئے۔ شرمیلا نٹ کھٹ، رنتو کا دھندلا دھندلا خاکہ بھی گھوم گیا۔

میں نے اپنی ماں سے پوچھا، رنتو! ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے، کیسا ہے"؟

"بس ٹھیک ہے" ماں کھڑکی سے کچھ عورتوں کو آتے ہُوتے دیکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے آواز دے کر اپنے بھانجے کو بلا لیا اور اس سے بات چیت کرنے لگا۔

الفتح

"کیا ہم لوگ ریل گاڑی میں جائیں گے"
"ہاں بھئی ہم لوگ ٹرین میں سفر کریں گے"
"اور بوٹ میں"
"ہاں ہمارے سفر کا آغاز تو بوٹ سے ہی ہوگا۔"

اتنے میں ایک عورت کی تیز آواز سنائی دی "میں بھی تو دیکھوں اپنے لاڈلے کو، کہیں وہ مجھے بھول ہی نہ گیا ہو۔ وہ عورت کمرے میں داخل ہونے کے بعد میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے عقب میں ماں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ کون عورت مجھ سے ملنے چلی آئی۔ میری حیرانگی دیکھ کر وہ چلّائی "تم مجھے نہیں پہچانے، ان بازوؤں کو دیکھو۔ میں نے تم کو گود میں کھلایا ہے۔" میری ماں نے یاد دلایا۔ سڑک کی دوسری طرف ایک چھوٹی سی دکان تھی یہ اسی دکان کو چلاتی تھیں۔ تمھیں یاد آیا۔ ان کا نام مسز پانگ ہے۔"

"مسز پانگ، ہاں کچھ کچھ یاد آیا۔ سڑک کے اس پار ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ اور مسز پانگ وہاں دن بھر بیٹھا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں وہ اپنے چہرے پر پوڈر لگایا کرتی تھیں"

مسز پانگ خوشی سے چلائیں، "پہچان لیا، پہچان لیا۔"

مسز پانگ نے کہا "ماسٹر زون، اب تم امیر بن گئے۔ یہ پرانے فرنیچر بہت بھاری ہیں، اور تم انہیں آسانی سے نہ لے جا سکو گے۔ ممکن ہے تمھیں اس کی ضرورت ہی نہ ہو۔ لہٰذا مجھے دیدو۔"

"میں بالکل امیر نہیں بنا، انہیں فروخت کر کے میں کچھ پیسے حاصل کرنا چاہتا ہوں"

"مجھ سے کیوں چھپاتے ہو" مسز پانگ نے کہا۔

"میں کچھ نہیں چھپا رہا ہوں، سچ بات کہہ رہا ہوں"

"انسان جتنا زیادہ پیسہ کماتا ہے اس کی پریشانیاں بھی بڑھتی ہیں اور پریشانیاں بڑھتی ہیں تو زیادہ پیسے کمانے کی کوشش کرتا ہے" وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

میں خاموش اسے کھڑا ہکا بکا اُسے دیکھتا رہ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد رشتہ داروں کا تانتا بندھ گیا۔ جب ان لوگوں سے فرصت ملی تو پڑوس کے لوگ ملنے چلے آئے۔ اس درمیان میں مجھے جب بھی موقع مل جاتا تھوڑے تھوڑے سامان کی پیکنگ کر لیتا۔

دُوسرے دن شدید سردی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں بیٹھا ہُوا گرما گرم چائے کی چُسکیاں لے رہا تھا۔ دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میں اُس سے ملنے کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

نووارد رنتو تھا۔ گو میں نے اُسے پہلی نظر میں پہچان لیا مگر وہ میرے خیالوں میں بسے ہُوئے رنتو سے قطعی مختلف تھا۔ وہ قد وقامت میں دُگنا ہوگیا تھا۔ اس کے بھاری بھرکم چہرے کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں کا رنگ سُرخ لیمپ کی مانند تھا۔ اس نے صاف سُتھرے کپڑے پہنے ہُوے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں کاغذ کا ایک پیکٹ تھا۔ خوشی کے مارے میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ بڑی مشکلوں سے کہہ پایا۔

"خوب، تو بھائی رنتو، یہ تم ہو" میں اُس سے ایک وقت میں ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر میرے جذبات کو الفاظ نہیں مِل رہے تھے۔

وہ خاموشی سے میرے سامنے کھڑا ہوا تھا اس کے چہرے پر خوشی اور رنج کے جذبات امنڈ رہے تھے۔ اس کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بالآخر اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہُوئے بڑی مشکل سے کہا۔

"ماسٹر"

ایک برقی لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ میرا سارا وجود جھنجھنا اُٹھا۔ ہمارے اور اس کے درمیان سماج کی جھوٹی رکاوٹ کھڑی تھی۔ میں خاموش تھا۔

اس نے گھوم کر کہا۔ "چلو ماسٹر کو سلام کرو بیٹا" اس نے اپنے عقب سے ایک دس گیارہ سال کے لڑکے کو میرے سامنے پیش کیا۔ یہ بیس سال پہلے کا رنتو تھا۔ لڑکے کے گلے میں بھی چاندی کا نکلاٹ پڑا ہُوا تھا۔

"یہ میرا پانچواں لڑکا ہے" اس نے کہا۔ یہ کچھ زیادہ شرمیلا اور بے وقوف ہے۔"

"چند دن پیشتر معلوم ہُوا تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔ میں یہ خبر سُن کر بہت خوش ہُوا۔" رنتو نے بڑی لجاجت سے کہا۔ میری ماں نے کہا:

"رنتو آخر تم اس قدر با ادب ہو کر کیوں بات کر رہے ہو۔ یہ تمہارے بچپن کا دوست ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اسے بھائی زون کہہ کر پکارو"

میرا بھانجہ رنتو کے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔ برآمدے میں سے دونوں کے ہنسنے کھیلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میری ماں نے رنتو کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

میں نے سوچا، زمین پر ابھی ایسی کوئی شاہراہ نہیں بنی جس پر اپنے اپنے دکھوں کا بوجھ اٹھائے ہُوئے سارے انسان گزر جائیں۔ لیکن مجھے یقین ہے ایک دن زمین کے سینے پر وہ راہ پھُوٹ نکلے گی اور پھر رنتو کی طرح سارے دُکھی انسان ایک ساتھ اس راستے سے گزریں گے۔

وہ کچھ جھجکتے ہُوئے بیٹھ گیا۔ ماں ہم دونوں کے لئے چائے بنانے چلی گئی۔

میں نے رنتو سے پوچھا:

"یار تمہارے دن کیسے گزر رہے ہیں؟"

میرے سوال سے اُس کے چہرے پر غم کی لکیریں اُبھر آئیں۔ اس نے بھرّائی آواز میں کہا:۔

"حالات اچھے نہیں ہیں۔ بڑی مشکل سے گزر ہوتا ہے۔ بعض دفعہ فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے اور قیمت چکانے کے لئے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، اور ہمارے پاس یہی نہیں ہوتا۔ کسانوں کی حالت کہیں زیادہ خراب ہے۔ سال بھر فصل اُگانے میں کڑی مشقت کرتے ہیں اور جب فصل مارکیٹوں میں لے جاتے ہیں تو وہاں اُن پر اتنے ٹیکس لگا دیئے جاتے ہیں کہ ان کے پاس کچھ نہیں بچتا۔"

اس نے بتایا:

"اس سال فصل اچھی نہیں ہُوئی، اس پر ٹیکس، فوجی، ڈاکو، سرکار کے کارندے اور مقامی جاگیردار ہر گھڑی سر پر سوار رہتے ہیں، زندگی بوجھ بن گئی ہے۔" اس کی آواز میں بے پناہ درد تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

گاؤں میں میرے نو روز گزر گئے۔ رنتو مجھ سے روز ملنے آتا تھا۔ نویں دن وہ اپنی چھوٹی بچی کو لے کر آیا۔ اس دن ہماری روانگی تھی۔ دن بھر لوگ مجھ سے ملنے آتے رہے۔ رنتو بھاگ بھاگ کر ہمارے کام میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ شام کے وقت ہم بوٹ پر سوار ہوگئے۔ رنتو نے مجھے ایک پیکٹ دیتے ہُوئے کہا:

"بھائی ایک مفلس آدمی کی طرف سے معمولی تحفہ ہے،" اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی طغیانی موجزن تھی۔

بوٹ دھیرے دھیرے روانہ ہُوا۔ گاؤں کے کچے پکے مکانات گزرنے لگے۔ کہیں کہیں چھتوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ کنارے پر کھیلتے ہُوئے بچے ہمیں دیکھ کر شور مچانے لگے۔ میں نے دیکھا، رنتو اپنی بچی کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ ہلا رہا تھا۔

"خدا حافظ میرے دوست، خدا حافظ میرے بچپن کے دوست۔ ہمارے درمیان کوئی دیوار نہیں ہے۔ کوئی خلیج نہیں ہے۔ ہم جب تک زندہ رہیں گے۔ ہمارے دل ایک دوسرے کے قریب دھڑکتے رہیں گے۔"

میں نے پیکٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں سے رنگ برنگ کی سیپیاں نکل پڑیں۔

میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے، میں نے کنارے کی طرف دیکھا۔ رنتو ایک چھوٹا نقطہ بنا نظر آیا۔ میں نے زور زور سے ہاتھ ہلایا۔

میں نے سوچا، "زمین پر ابھی ایسی کوئی شاہراہ نہیں بنی جس پر اپنے اپنے دُکھوں کا بوجھ اُٹھائے ہُوئے سارے انسان گزر جائیں۔ لیکن مجھے یقین ہے، ایک دن زمین کے سینے پر وہ راہ پھوٹ نکلے گی اور پھر رنتو کی طرح سارے دُکھی انسان، ایک ساتھ، اس راستے سے گزریں گے۔"



جامعہ کراچی کے ملازمین درجہ چہارم کی المناک داستان

وہ ”اسلام پسند“ تعلیمی وڈیرے کے ہاری ہیں

: نمائندہ الفتح :

ایوب خاں نے اپنے دورِ اقتدار میں وطنِ عزیز کے ہر شعبۂ زندگی کو اپنی آمریت کے استحکام کی ضمانت حاصل کرنے کے لئے اپنے ڈھب پر ڈھال لیا۔ بنیادی جمہوریت کے ذریعے جمہوریت کی دھجیاں اڑائیں۔ جرگہ جیسے غیر مہذب طریقے رائج کر کے عدلیہ کا وقار ختم کیا۔ پریس آرڈی ننس کے ذریعہ زبان و قلم پر پہرے بٹھلائے۔ یونیورسٹی آرڈیننس نافذ کر کے تعلیم اور طالب علموں پر جیل خانوں کا سا ماحول مسلط کیا۔ اور یہ بھی ایوب خان ہی کا کرشمہ ہے کہ اس کے دور میں تعلیمی وڈیروں نے جنم لیا۔ تعلیمی ادارے جاگیر کے طور پر تقسیم ہوئے۔ جامعہ کراچی کا قرعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نام پڑا۔

اشتیاق حسین قریشی ان تعلیمی وڈیروں میں سے ایک ہیں جنھیں سرمایہ داروں کی آمریت کے دربارِ خاص میں کافی اہمیت دی جاتی ہے۔ موصوف کی شخصیت کے بارے میں بہت ساری باتیں زبان زد خاص و عام ہیں لیکن ان کو جاننے کے لئے کسی بہت بڑے دماغ یا سمجھ کی قطعی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کراچی یونیورسٹی کے پستہ قد وائس چانسلر کے نحیف و نزار ڈھانچے میں ایوب خان نے ”وائٹ ہاؤس“ کی تعلیمات اور اسناد سے مسلح ”اسکالر“ کو محسوس کر لیا تھا، اور موصوف کی یہی خصوصیت انھیں دربارِ خاص میں لے جانے کا باعث بنی تھی۔ آمرِ مطلق کے چہیتے تعلیمی وڈیرے نے اپنے عہدِ وائس چانسلری میں جو کچھ کیا اس سے ان کے بارے میں قائم کی جانے والی رائے ایک مسلمہ ثبوت بن گئی ہے۔

اشتیاق حسین قریشی نے اپنی وائس چانسلری کے اوائل میں ہی ”مشی گن“ اور کیلی فورنیا کے فارغ التحصیل ”ایشیائی امور کے ماہرین“ سے ملی ہوئی ہدایات کے تحت محب وطن، سامراج دشمن اور جمہوریت پسند طلبا و اساتذہ کو مختلف طریقوں سے اپنا ہدف بنایا اور ۶ عرصہ دراز تک وہ یہ کام کرتے رہے۔ سات سمندر پار کے ماہرین کی حکمت عملی کے تحت طلبا کو لگام دینے کے لئے ان کی خاص کوششوں سے یونیورسٹی آرڈی ننس جیسا ہتھیار بنایا گیا جس پر ایوب شاہی نے منظوری کے دستخط ثبت کئے۔ ان کی وائس چانسلری کے تمام عرصہ میں طلبا اور اساتذہ کے خلاف سازشی اور شرمناک کارروائیاں ہوتی رہیں۔ انہی کے دور میں سب سے زیادہ طالب علم درس گاہوں سے جیلوں میں بھجوائے گئے —— یونیورسٹی سے خارج کئے گئے اور اسی نوعیت کی دیگر انسانیت سوز حرکات کی بھینٹ چڑھتے رہے۔ اساتذہ کو بھی اپنے مخصوص ہتھکنڈوں کے ذریعے انھوں نے پریشان کیا یہاں تک کہ خوددار اور اصول پسند اساتذہ کو ملازمتوں سے علیحدہ کیا گیا۔ اپنے ان کرتوتوں کو چھپانے کے لئے اشتیاق حسین قریشی نے اپنے بھنڈار میں ”اسلام پسندی“ کا سرٹیفکیٹ سجا رکھا ہے۔ پاکستان میں امریکی سامراج کے مقامی ایجنٹوں نے کافی عرصہ سے ”اسلام پسندی“ کا ہی چکر چلایا ہوا ہے۔

اشتیاق حسین قریشی کے سامراج نواز لچھن کراچی کے انقلابی طلبا بہت عرصہ پہلے محسوس کر چکے تھے۔ طالب علموں نے متعدد بار کراچی یونیورسٹی کے معاملات کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ اور اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے ذمہ دار تعلیمی وڈیرے اشتیاق حسین قریشی کی برطرفی کا بھی۔ تمام ناانصافیوں اور شرمناک مظالم کے خلاف وہ احتجاج کے عام طریقوں کے ذریعہ حکومت اور عوام کو باخبر کرتے رہے۔ مقبوضہ پریس نے اپنے اخبارات میں رائے عامہ سے مجبور ہو کر تھوڑی سی جگہ دی لیکن اشتیاق حسین قریشی نے کراچی یونیورسٹی کے محنت کشوں پر جو مظالم ڈھائے ان کے بارے میں مقبوضہ پریس نے ایک لفظ بھی شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور اس طرح عوام کے ایک بڑے حصہ تک ان مظلوم ملازمین کی آواز نہیں پہنچی۔

جامعہ کراچی کے درجہ چہارم کے ملازمین کے ساتھ جو بیسویں صدی کے مہذب دور میں ایک تعلیمی ادارے میں خدمات انجام دیتے ہیں دورِ غلامی کے خریدے اور بیچے جانے والے غلاموں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ اشتیاق حسین قریشی کی جاگیر میں ان کی حیثیت ایک وڈیرے کے کھیت میں کام کرنے والے بے بس ہاری جیسی ہے جو ہزار ظلم برداشت کرنے کے بعد حرفِ شکایت بھی زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہر چند اسلام پسند تعلیمی وڈیرے کے حساب سے ”فٹ“ ہے۔ ان ملازمین کی زبوں حالی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت نے غیر ماہر مزدوروں کی کم از کم اجرت ایک سو چالیس روپیہ مقرر کی ہے لیکن ان بیچاروں کو الاؤنس وغیرہ ملا کر کل ایک سو ایک روپیہ ملتے ہیں۔ کراچی جیسے مہنگے شہر میں محنت کرنے والا ایک جسم بھی اس قلیل تنخواہ میں گزر نہیں کر سکتا چہ جائیکہ وہ اپنے خاندان کی کفالت کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کی خاطر کیا وہ بھی بدعنوانیوں کا ارتکاب کرے؟ لمبے ہاتھ والوں نے تو یہ طریقہ اپنایا ہوا ہے۔ کیا کہتے ہیں اسلام پسند وائس چانسلر اس سوال کے جواب میں؟

ناکافی تنخواہ، بدترین حالات کار اور اس پر اشتیاق حسین قریشی کے مامور کئے ہوئے طفیلیوں کی تھانیداری۔ بے چارے چہارم درجہ کے ملازمین کچھ کہنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے۔ سائنس ڈیپارٹمنٹ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے سے چھ بجے شام تک بھاڑے کی بیل کی مانند کام لیا جاتا ہے۔ مقررہ اوقات سے زائد کام کرنے کا زائد معاوضہ (اوور ٹائم) نہیں دیا جاتا۔ اگر کام نہ کریں تو دھونس و دھاندلی کے حربوں سے اتنا تنگ کیا جاتا ہے کہ ملازمت کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں۔ شعبۂ انتظامیہ میں تین بجے کے بعد کام کا اوور ٹائم ملتا ہے۔ سائنس ڈیپارٹمنٹ کے لوگ اس سے بھی محروم ہیں۔ ایک ہی ادارے کے دو مختلف شعبوں میں اس دوعملی کا کیا جواز ہے۔

ملازمین کے لئے ہر سال موسم سرما و گرما میں وردیاں فراہم کی جانی چاہئیں لیکن اس میں بھی گھپلے کئے جاتے ہیں۔ ”اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنے اپنوں کے دے“ کے مصداق کسی کو لیب بوائے مل گئی۔ کسی کو نہ ملی کیمسٹری کے صادق کو ایک ہفتہ کی ملازمت پر وردی مل گئی لیکن بایو کیمسٹری کے لیب بوائے کو تین سالہ ملازمت میں ایک بار بھی وردی نہیں دی گئی۔ کہا جاتا ہے گزشتہ سال ایک ایک اسسٹنٹ رجسٹرار نے تمام وردیاں کھا پی کر برابر کر دیں۔

اشتیاق حسین قریشی صاحب کی زیر ہدایت چند خوشامدی سفید پوش ملازموں نے درجہ سوم و چہارم کے ملازمین کی یونین کے نام سے بہت عرصہ پہلے ایک یونین قائم کی تھی جس کے صدر عقیل احمد زبیری اور جنرل سیکرٹری مومن صاحب تھے۔ اس یونین کے کارپردازوں نے اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے ملازمین کے لئے کچھ بھی نہیں کیا اور وائس چانسلر کی خوشامد کرتے رہے۔ دوسری طرف ملازمین سے باقاعدہ چندہ وصول کیا جاتا رہا۔ چندے کا حساب کتاب کبھی پیش نہیں کیا گیا۔ سنہ ۱۹۶۹ میں یہ یونین ختم ہو گئی۔

گزشتہ دنوں درجہ چہارم کے ملازمین نے مہنگائی اور انتظامیہ کی بے حسی سے تنگ آ کر ۱۳ مطالبات

پیش کئے۔ ان مطالبات کا پیش کرنا تھا کہ سابق یونین کے مزدور دشمن عہدے دار حرکت میں آگئے۔ مزدور دوستی کا لبادہ زیب تن کرکے درجہ چہارم کے ملازمین کی ہمدردی کا دم بھرنے لگے۔ اور ۳۲ مطالبات کی ایک طویل فہرست ترتیب دے کر درجہ چہارم کے ملازمین پر اس پر دستخط لینے کی کوشش کی مگر یہ حربہ ناکام رہا۔ درجہ چہارم کے مظلوم ملازمین نے اس پُرفریب جال میں دوبارہ آنے سے انکار کر دیا اور ایک بھی فرد نے اس پر دستخط نہیں کئے۔

طویل تجربات نے درجہ چہارم کے ملازمین کو اتنا شعور ضرور بخش دیا ہے کہ سفید پوش کبھی مزدوروں کی قیادت آخری منزل تک نہیں کر سکتے۔ مصلحت کوشی ان کی فطرت ہوتی ہے۔ چنانچہ جامعہ کراچی کے درجہ چہارم کے ملازمین اپنے تیرہ مطالبات تسلیم کرانے کا عزم کئے ہوتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں کسی قربانی سے گریز نہیں کریں گے۔ مطالبات یہ ہیں۔

۱۔ مکان کا کرایہ اس وقت تین روپیہ ماہوار دیا جاتا ہے جبکہ کراچی میں جھگی کا کرایہ بھی دس روپیہ سے کم نہیں ہے۔ لہذا مکان کا کرایہ تنخواہ کا تیس فی صد یا کم سے کم پچیس فیصد منظور کیا جائے۔

۲۔ منظور شدہ سواری الاؤنس بہت ناکافی ہے۔ لہذا سواری الاؤنس کم از کم تیس روپے منظور کیا جائے

۳۔ واشنگ الاؤنس ایک روپیہ سے بڑھا کر پانچ روپیہ کر دیا جائے۔

۴۔ سائنس کے شعبوں میں کام کرنے والے لیب اٹینڈنٹ اور لیب اسسٹنٹ کو سال میں تین ٹھنڈی وردی ایک گرم وردی اور دو لیب کوٹ منظور کی جائیں۔ کیونکہ پریکٹیکل میں کام سے تیزاب کی وجہ سے وردی اور کپڑے جل جاتے ہیں۔

۵۔ دوسرے اداروں کی طرح ہم لوگوں کو بھی اوورٹائم دیا جائے۔ کیونکہ ہم لوگوں کو اکثر چھ سات بجے تک کام کرنا پڑتا ہے جس کا ہم کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔

۶۔ درجہ سوم کے ملازموں کو ان کی پہلی سروسوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کو فل گریڈ دے دیا گیا مگر ہم کو اس رعایت سے محروم رکھا گیا۔ جس کی تمام تر ذمہ داری اسسٹنٹ رجسٹرار پر عاید ہوتی ہے۔

۷۔ درجہ چہارم کے ملازمین کو جو کہ میٹرک پاس ہوں ان کو سب سے پہلے کلرک یا لیب اسسٹنٹ کی آسامی پر فائز کیا جائے اور براہ راست یا باہر سے کسی کو چانس نہ دیا جائے۔

۸۔ میڈیکل الاؤنس میں اضافہ کیا جائے کیونکہ موجودہ الاؤنس ناکافی ہے۔ اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے فرق کو جلد از جلد ختم کیا جائے۔

۹۔ درجہ چہارم کے ملازمین کو ایک سال کی سروس کے بعد مستقل کیا جائے۔

۱۰۔ درجہ چہارم کے ملازمین کو یونین کی تشکیل کی اجازت دی جائے۔

۱۱۔ درجہ چہارم کے ملازمین کو جو کہ مستقل ملازم نہیں ہیں اور جن کو ایک سال سے زیادہ سروس کرتے ہو گیا ہے ان کو بھی میڈیکل الاؤنس دیا جائے۔

۱۲۔ انجینئرنگ شعبہ میں درجہ چہارم کے ملازمین کو جو کہ رات دن شعبہ میں کام کرتے ہیں ان کو گرم وردی کے ساتھ گرم جرسی بھی دی جائے۔

۱۳۔ درجہ چہارم کے ملازمین کو دوسرے اداروں کے ملازمین کی طرح سفری الاؤنس بھی منظور کیا جائے جو کہ عین قانون کے مطابق ہے۔

نوکر شاہی نیشنل بنک کے صنعتی امن کو تباہ کر رہی ہے

سیالکوٹ لوکل بنک ایمپلائز ایکشن کمیٹی نے صنعتی تعلقات

کے قانون مجریہ ۱۹۶۹ء کی ذیلی دفعہ ۱۸ ای اور ۲۳۲ میں ترمیم اور اضافہ پر شدید اظہار افسوس کرتے ہوئے اس اقدام کو غیر منصفانہ قرار دیا ہے، اور حکومتِ پاکستان سے پُرزور اپیل کی ہے کہ بنک ملازمین کی خدمات اور احساسات کا خیال رکھتے ہوئے اس نئی ترمیم کو فوری طور پر منسوخ کر دیا جائے۔ ایکشن کمیٹی نے ایک قرارداد کے ذریعے نیشنل بنک اسٹاف یونین سیالکوٹ کو ان کے جائز اور مناسب مطالبات کے سلسلے میں اپنی پوری تائید و حمایت کا یقین دلایا ہے اور نیشنل بنک کے مینجنگ ڈائریکٹر اور بنک ایسوسی ایشن کے چیئرمین جناب انور قادر کو صنعتی امن کی بقا، ملک و قوم اور نیشنل بنک جیسے قومی ادارے کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر سیالکوٹ یونین کے مطالبات فوری طور پر منظور کر لینے کا مشورہ دیا ہے۔ ایکشن کمیٹی کی قرارداد میں کہا گیا ہے چونکہ نیشنل بنک کا انتظام بیورو کریسی کے ہاتھ میں ہے اس لئے انتظامیہ کا کردار ہمیشہ مزدور دشمن رہا ہے۔ اگر نیشنل بنک کی انتظامیہ اپنی غلط روش پر اڑی رہی اور سیالکوٹ یونین کے مطالبات پر فوری اور خصوصی غور نہ کیا گیا تو سیالکوٹ کے تمام لوکل بنکوں کے ملازمین اس جد و جہد میں سرگرم عمل ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور اس صنعتی بحران کی تمام ذمہ داری نیشنل بنک کی انتظامیہ پر ہو گی۔ ایکشن کمیٹی نے نیشنل بنک کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر انور قادر اور پرنسپل آفس لاہور کے افسران کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ ظلم کرنے والوں کو آخر کار عوامی جدوجہد کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے وہ دانش مندی، معاملہ فہمی اور دور اندیشی سے کام لے کر اسٹاف یونین سیالکوٹ کے تمام مطالبات فوری طور پر پورے کر دیں۔

آخر میں ایکشن کمیٹی کی قرارداد میں مزید کہا گیا ہے کہ ٹریڈ یونین ایکٹ مجریہ ۱۹۲۶ء کو غیر ملکی حکمرانوں نے بنایا تھا۔ اس میں بھی دستخطی اختیار رکھنے والے ملازمین کو یونین سازی کا حق دیا گیا تھا مگر آزادی کے اس دور میں بنکاری کی صنعت سے تعلق رکھنے والے ملازمین کو اُن کے جائز اور بنیادی حقوق سے محروم کر دینا کہاں کا انصاف ہے۔

میکڈانلڈ کے مزدوروں کی حالتِ زار

میکڈانلڈ کا سیٹن لیبر ایمپلائز یونین کے جنرل سیکرٹری محمد یامین نے ایک بیان میں انتظامیہ، لیبر ڈائریکٹریٹ اور پولیس کے شرمناک گٹھ جوڑ اور مزدور دشمن رویئے کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک کی سب سے بڑی کنسٹرکشن کمپنی ہونے کے باوجود مزدوروں کو بونس، گریجویٹی، نوٹس کی تنخواہ، زخمی ہونے کی صورت میں علاج کی سہولتیں اور چھٹیوں کی مراعات سے محروم کر رکھا ہے۔ کمپنی کم از کم اجرت کے قانون کی کھلم کھلا مذاق اڑا رہی ہے۔ لیکن محکمہ محنت اور قانون نافذ کرنے والے دیگر ادارے ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں۔ بلکہ اپنے جائز حقوق مانگنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔

انہوں نے کہا ہے کہ گذشتہ دنوں مزدوروں نے اپنے جائز حقوق کے حصول کی جد و جہد شروع کی۔ تو ڈاکٹر ایس یو قریشی اور غلام محمد انجینئر نے اس جد و جہد کو دبانے کی بھرپور کوشش کی جب بات اور بڑھی تو انتظامیہ نے کہا کہ مطالبات کی فہرست پر دس افراد دستخط کریں۔ اور انتظامیہ انہی افراد سے مذاکرات کرے گی۔ چنانچہ یونین کی جانب سے مطالبات کی فہرست دی گئی۔ جس پر محمد ادریس، رحمت اللہ، محمد ریاض، عبداللہ، فیض اللہ، میر افضل، حق نواز اور شاہ محمود وغیرہ کے دستخط تھے۔ یونین نے اس فہرست کی ایک نقل ڈپٹی ڈائریکٹر، لیبر ویلفیئر اور ایک کراچی کے ڈپٹی کمشنر کو بھی بھیج دی۔ کمپنی کی انتظامیہ نے مذاکرات کرنے کی بجائے بغیر کسی نوٹس یا وجوہ کے ان دس افراد کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ حالانکہ یہ مستقل ملازم تھے۔ اور وہ برسوں سے اس ادارے میں کام کر رہے تھے۔ جب مذکورہ ملازمین اپنا حساب اور نوٹس کی تنخواہ لینے دفتر گئے تو انتظامیہ نے تنخواہ دینے سے انکار کر دیا اور پولیس کو ان کے پیچھے لگا دیا۔

مسٹر امین نے یہ انکشاف کیا ہے کہ پولیس ان برطرف شدہ مزدوروں کو بغیر وارنٹ کے کئی مرتبہ تھانے بلوا چکی ہے۔ انہوں نے انتظامیہ، پولیس اور محکمہ محنت کو متنبہ کیا ہے کہ وہ محنت کشوں کو ان کا حق دیں اور مزدور دشمنی چھوڑ دیں۔

ہاری مزدور کانفرنس کا انعقاد

عام انتخابات کے بعد ملک بھر میں وسیع پیمانے پر مزدوروں کو برطرف اور کسانوں کو بے دخل کیا جا رہا ہے۔ ان برطرفیوں اور بے دخلیوں نے محنت کشوں میں سخت بے چینی اور اضطراب پھیلا دیا ہے۔ مزدور اور کسان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کرنے والے نمائندوں کو منتخب کرنے کے باوجود انہیں سوکھی

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



(a) Union Committee No.1.

Month:	Collections:	Previous balance in hand.	Total.	Spent out of it.	Credited in Bank.	Cash in hand retained.
March '67.	Rs.922/97	Rs. 14/25	Rs.937/22	Rs.93/=	Rs.549/22	Rs.295/=
April '67.	Rs. 86/=	Rs.295/=	Rs.381/=	Rs.16/=	Rs. 60/=	Rs.305/=
May '67.	Rs. 92/=	Rs.305/=	Rs.397/=	Rs.57/25	Rs.102/=	Rs.237/75
June '67.	Rs. 58/=	Rs.237/75	Rs.295/75	Rs.36/88	Rs. 50/87	Rs.208/=

Contd....on....P/9.........

بلدیہ لانڈھی کورنگی کے کونسلروں کی بدعنوانیاں!

عوامی نمائندوں نے سرکاری رقم بنکوں کی بجائے اپنی جیبوں میں جمع کی

الفتح رپورٹ

کورنگی لانڈھی کے سلسلے میں گزشتہ شمارے کے فیچر میں ہم نے مختلف مسائل کا تذکرہ کیا تھا۔ اس میں بلدیہ لانڈھی کے ان عوامی نمائندوں کی بدعنوانیوں کے بارے میں سرسری طور پر بات کی گئی تھی جو ایوب خاں کی آمریت کی پیداوار تھے۔ اس رشتے سے ان کی اکثریت نے جو کچھ کیا وہ بدعنوانیوں کی ایک مرصّع داستان ہے۔ جس کا تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ اب یہ نمائندے اپنے موجودہ عہدوں پر آخری سانسیں لے رہے ہیں اور موجودہ سیاسی بحران کے نمٹنے کے بعد نئے نمائندوں کی آمد آمد کا شور ہے۔ لہٰذا نئے آنے والے بھی اپنے پیشروؤں کے چھوڑے ہوئے نقوش پر قدم رکھیں تو ذرا پھونک کر اور ایوب خانی صحافت کا وہ دور بھول کر آئیں جبکہ اس کے مقبوضہ اخبارات (جو ابھی تک مقبوضہ ہیں) کے بعض رپورٹر معاوضوں پر ان کے مفادات کی نگرانی کا کام کیا کرتے تھے۔ اور ان کے سروں پر احتساب کی کوئی چھری نہیں لٹکتی تھی۔

بلدیہ لانڈھی کورنگی کے منتخب کونسلروں کے سلسلے میں محکمہ بلدیات کی وہ رپورٹ خصوصاً بہت دلچسپ ہے جس میں ان نمائندوں کی بدعنوانیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور مکمل تحقیقات کے بعد ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ یہ رپورٹ کوئی دو تین سال پرانی ہے۔ لیکن ان نام نہاد نمائندوں کی بدعنوانیوں کے بارے میں ایک مثالی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے اس رپورٹ کے اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس رپورٹ میں "عارضی بدعنوانیاں" کے عنوان سے لکھا گیا ہے:۔

"تمام یونین کمیٹیوں میں جو رقم جمع کی گئی وہ بنک میں جمع کرانے کے بجائے مہینوں اپنی جیبوں میں رکھی جاتی رہی جبکہ یونین کمیٹی اکاؤنٹ رولز کی دفعہ ۱۰ (۵) کے تحت ہر روز جمع ہونے والی رقم کو اسی روز بنک میں جمع کرانا لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ہی رول ۱۵ اور ۳ کی خلاف ورزیاں کی گئی ہیں۔ جن پر یونین کمیٹیوں کے چیئرمینوں سے توضیح طلب کی جائے ان میں چند سنگین بدعنوانیاں حسب ذیل ہیں:۔

یونین کمیٹی نمبر ایک میں مارچ ۱۹۶۷ء میں ۹۲۲/۹۷ روپے جمع ہوئے۔ ۱۴/۲۵ روپے پچھلا بیلنس تھا۔ اس میں سے ۹۳/- روپے خرچ ہوئے۔ بنک میں ۵۴۹/۲۲ روپے جمع کرائے گئے۔ جبکہ ۲۹۵/- روپے اپنی ذاتی جیب میں رکھے گئے۔

اپریل ۱۹۶۷ء میں ۳۸۱/- روپے میں سے بنک میں ۶۰/- روپے جمع کرائے گئے اور ۳۰۵/- روپے چیئرمین نے اپنے پاس رکھے۔ مئی ۱۹۶۷ء میں چیئرمین صاحب نے ۲۳۷/۷۵ روپے اور جون ۱۹۶۷ء میں ۲۰۸/- روپے اپنے پاس رکھے۔ میونسپل کمیٹی لانڈھی کورنگی سے سیکرٹری کی تنخواہ کی ادائیگی کے لئے ۷۵۰/- روپے وصول کئے گئے۔ لیکن اس رقم کا کیش بک میں اندراج کئے بغیر اسے دوسرے کاموں کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس طرح ۳۱ مارچ ۱۹۶۷ء کو میونسپل کمیٹی سے ۱۴۱/- روپے وصول کئے گئے۔ لیکن انہیں بنک میں جمع نہیں کرایا گیا۔ بلکہ اسے اپنے قبضہ میں رکھا گیا۔"

اس رپورٹ میں ایسی ہی اور چھوٹی چھوٹی بدعنوانیوں کی تفصیلات بتاتے ہوئے یونین کمیٹیوں کے دفاتر کی "بے قاعدہ تعمیر" کے ضمن میں لکھا گیا ہے:۔

"یونین کمیٹی نمبر ایک اور دو نے کے ڈی اے کی زمینوں پر اپنے دفاتر کی تعمیر کے لئے ٹھیکیداروں سے بات چیت کی۔ یونین کمیٹی نمبر ایک نے سابقہ ٹاؤن کمیٹی کے دفتر پر قبضہ کرکے وہاں اپنا کام شروع کیا اور اسی اثنا میں اس کے چیئرمین ملک داد خان نے یہ رپورٹ دی کہ انہوں نے دفتر کی تعمیر کا کام مکمل کر لیا ہے اور اس پر جو رقم خرچ ہوئی ہے وہ یونین کمیٹی کے چند افراد نے ذاتی طور پر بطور قرض ادا کی ہے۔ بلدیہ نے اپنے خط نمبر ایل کے ایم سی/۶۶/۶۱ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۶۶ء دفتر کی عمارت کی "اپنی مدد آپ" کے تحت تعمیر پر "نو آبجکشن" دے دیا۔ اور ساتھ یہ شرط لگائی کہ کھلی جگہ پر دفتر کی تعمیر کے لئے کے ڈی اے کا کلیرنس بھی پیش کیا جائے۔ یہ مسئلہ ۱۹ نومبر ۱۹۶۶ء کو میونسپل کمیٹی کے سامنے پیش بھی ہوا جس نے تعمیر پر ہونے والی لاگت کا تخمینہ لگانے کے لئے سب کمیٹی قائم کر دی۔ سب کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی وہ ایک بے نتیجہ رپورٹ تھی۔ چیئرمین یونین کمیٹی نمبر ایک ملک داد خاں کی رپورٹ کے تحت تعمیر پر آنے والی کل لاگت ۹۳۹۴/۱۲ روپے تھی۔ جس میں سے نصف کی ادائیگی بلدیہ کے ذمہ تھی۔ اس تمام رقم کا جو بھی لین دین ظاہر کیا گیا ہے وہ سخت مشکوک ہے۔ اور اس کی فوری طور پر اعلےٰ سطحی تحقیقات کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ دفتر یونین کمیٹی نمبر ایک اور دو کے خلاف (جس کا کیس نمبر ایک ہی کی طرح ہے) مغربی پاکستان میونسپل فنڈ (آڈٹ) رولز مجریہ ۱۹۶۴ء کے تحت پری سرچارج

الفتح

مہمان خصوصی بننے کے شوق میں بلدیہ کا دیوالیہ نکال دیا

سرٹیفکیٹ جاری کر سکے۔"

رپورٹ میں ان دفتروں کی عمارت کی تعمیر کے اسکینڈل کے بارے میں مزید تفصیلات بتاتے ہوئے یہ نکتے خاص طور پر پیش کئے گئے۔

۱- جس زمین پر دفاتر تعمیر ہوئے وہ میونسپل کمیٹی کی ملکیت نہیں تھی لہٰذا یہ دفاتر زمین حاصل کئے یا تعمیر کی اجازت حاصل کئے بغیر کیوں تعمیر کئے گئے۔

۲- ٹھیکہ دار کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ بی ڈی ممبر ہے۔ قاعدے کی رو سے کوئی بی ڈی ممبر اپنی ہی یونین کمیٹی کے ٹھیکے نہیں لے سکتا۔

۳- دفتر کی تعمیر کی اجازت "اپنی مدد آپ" کے اصول کے تحت تعمیر کرنے کے لئے دی گئی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں کسی نے رضاکارانہ طور پر کوئی کام نہیں کیا۔ اور یہ رقم میونسپل کمیٹی فنڈ یا یونین کمیٹی فنڈ سے ادا کی گئی۔

۴- کام کے سلسلے میں ضروری رسمی کارروائیاں نہیں کی گئیں۔"

رپورٹ نے یونین کمیٹی نمبر ایک کے بارے میں ایک کیس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس نے عید ملن پارٹی کے نام پر ۱۰ مارچ ۱۹۶۷ء کو ۷۵/- روپے نکالے لیکن اس کے جو اخراجات ظاہر کئے گئے وہ کسی قاعدے کے ذیل میں نہیں آتے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ رقم چیئرمین سے واپس طلب کی جائے۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو چیئرمین کے خلاف بری سرچارج سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے۔ اس قسم کی بدعنوانیاں تقریباً ہر یونین کمیٹی میں دہرائی گئیں اور دہرائی جا رہی ہیں۔ رپورٹ میں تمام یونین کمیٹیوں کے اکاؤنٹ کے تفصیلی جائزے کے بعد ان کے اکاؤنٹ کے بارے میں جو تفصیلات دی گئی ہیں ان کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یونین کمیٹیوں کا اکاؤنٹ

"یونین کمیٹی نمبر ۳، ۵ اور نمبر دس کے علاوہ ہر یونین کمیٹی کا اکاؤنٹ نامکمل ہے۔ ان میں خصوصاً حسب ذیل باتیں قابل ذکر ہیں:-

۱- کیش بکوں میں اندراجات صحیح طور پر نہیں کئے گئے۔ بیلنس غلط دکھائے گئے ہیں۔

۲- جو رقم جمع ہوتی رہی ہے وہ ذاتی قبضے میں رکھی جاتی رہی ہے۔

۳- یونین کمیٹی کے جو دفاتر کرائے پر لئے گئے کرائے نامے حاصل نہیں کئے گئے۔

۴- کیش بک کے علاوہ یونین کمیٹی رولز کے تحت مروجہ فارم استعمال نہیں کئے گئے۔

۵- اسٹیمپ رجسٹر، منقولہ جائیداد رجسٹر، غیر منقولہ جائیداد رجسٹر اور اسٹاک رجسٹر وغیرہ کا استعمال بالکل نہیں کیا گیا۔

۶- سالانہ اور سہ ماہی اکاؤنٹ نہ تو تیار کئے گئے اور نہ کنٹرولنگ اتھارٹی کو پیش کئے گئے۔

۷- رسید بکوں کا قطعی کوئی اکاؤنٹ موجود نہیں۔"

رپورٹ میں ان تمام غلطیوں، کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کو دور کرنے اور ان کی تحقیقات کرنے کی ہدایتیں کی گئی تھیں۔ ان ہدایتوں پر کہاں تک عمل ہوا؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہی تمام چیئرمین اور کونسلرز حضرات آج بھی پہلے کی طرح دندنا رہے ہیں اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں ہے۔ جس زمانے کی یہ رپورٹ ہے اس زمانے میں فضیل احمد بلدیہ کے چیئرمین تھے۔ اس رپورٹ میں چیئرمین سے کہا گیا تھا کہ وہ ان تمام امور کی جانب توجہ دیں لیکن چیئرمین صاحب اس وقت اپنا حساب کتاب ٹھیک کرنے میں مصروف تھے۔ لہٰذا کونسلروں کی باگیں کھینچنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

فضیل احمد کی بدعنوانیاں

فضیل احمد کے بارے میں بھی پچھلی مرتبہ ہم نے لکھا تھا لیکن ان کے بارے میں بھی بہت سی دلچسپ تفصیلات باقی رہ گئی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ موصوف کا تعلق لکھنؤ سے نہیں الہ آباد سے تھا۔ لاہور میں ایک عرصے تک وہ سرکار کے پاس ملازم رہے تھے۔ اور یہیں ان کی دوستی ٹرسٹ کے ایک روزنامے کے اس رپورٹر سے پروان چڑھی تھی جس نے کراچی میں فضیل احمد کی بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے کی ممکنہ کوششیں کیں۔ فضیل صاحب سے متعلق سب سے دلچسپ قصہ ان کی گاڑی کا ہے۔ شاید ان کے بچوں کا اصرار تھا یا خود ان کے اندر کی تعیش پسندی جوش مار رہی تھی کہ ایک عدد نئے ماڈل کی خوب صورت کار ذاتی استعمال کے لئے بھی ہونی چاہیے۔ ایسی خواہشات کی تکمیل کے لئے کورنگی لانڈھی کے عوام کی رگوں سے کھینچا ہوا لہو بلدیہ کے بجٹ کی صورت میں موجود تھا۔ لہٰذا اٹھارہ ہزار روپے کی کارٹینا خریدی گئی۔ چند کونسلروں نے جو ایمانداری کا بھرم قائم رکھے ہوتے ہیں اس کے خلاف بلدیہ کے ایوان میں شور مچایا۔ قاعدے کی رو سے بھی اس کی اجازت ایوان سے لینی ضروری تھی۔ لیکن ایوان کی نامنظوری کی کوئی پرواہ کئے بغیر انہوں نے اس کی منظوری اجلاس کے بعد اس کی کارروائی میں از خود درج کرالی۔ بعد ازاں رسمی کارروائی مکمل کرنے کے لئے بالا ہی بالا کنٹرولنگ اتھارٹی سے اجازت نامہ بھی حاصل کر لیا۔

موصوف کو مہمان خصوصی بننے کا بہت شوق تھا۔ جماعت اسلامی کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ لہٰذا وہ اکثر و بیشتر جماعت کی کسی ذیلی تنظیم کی تقریبات میں مہمان خصوصی بنتے رہے اور بلدیہ کے بجٹ سے ان کے لئے عطیات کا اعلان کرتے رہے۔ اس طرح ان کے اور جماعت اسلامی کے درمیان جو "معاشی رشتہ" قائم ہوا اس نے انہیں جماعت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنائے رکھا۔ اسی لئے بلدیہ نے جب یونین کمیٹیوں میں لائبریریاں قائم کرنے کی منظوری دی تو جن مصنفین کی کتابیں خریدنے کی ہدایت کی گئی ان میں سب سے زیادہ تعداد ایوب خاں کی "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کی تھی جبکہ دوسرے نمبر پر مولانا مودودی کی کتابیں تھیں۔ جماعت کا "ملت اسکول" جو ایک سرکاری عمارت پر ناجائز قبضہ کر کے قائم کیا گیا تھا۔ اس کی سرپرستی بھی ایک عرصے تک یہی بزرگ فرماتے رہے۔ اپنے ایک بھائی سہیل احمد کو انہوں نے ایک نیا عہدہ نکال کر بلدیہ کے اسکولوں کا انچارج بنا رکھا تھا۔

چیئرمین کی سرکردگی میں وائس چیئرمین اور دوسرے کونسلروں کی بدعنوانیاں بھی پروان چڑھتی رہیں اور اب تک اسی رفتار سے آگے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ اس وقت کے وائس چیئرمین اسلام الدین نے تھلوں کے بعد بلدیہ کے ٹھیکوں پر بھی قبضے کرنے شروع کئے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک مشہور ٹھیکہ چنگی کی تعمیر کا تھا۔ لیکن ان کے ٹھیکے کے تحت تعمیر ہونے والی چنگی پہلی ہی بارش میں ڈھیر ہو گئی۔ چیئرمین حضرات کا بھی یہی حال رہا۔ یونین کمیٹی نمبر ۷ کے چیئرمین صغیر صاحب نے اپنے گھر کی بیٹھک کو دفتر کے طور پر استعمال کیا۔ لیکن اس کے لئے وہ اسی روپے ماہانہ کرائے کے طور پر وصول کرتے تھے۔ چنگی پر بھی یہی کیفیت تھی۔ کورنگی کے مختلف کارخانے داروں اور بڑے دکانداروں نے، مختلف چیئرمینوں نے اپنے بھتے باندھے ہوتے ہیں اور ان کے اشاروں پر ان کے مال پر کوئی چنگی وصول نہیں کی جاتی۔

موجودہ وائس چیئرمین محمد ابراہیم صاحب جنہوں نے یہ عہدہ خریدنے کیلئے بھاری قیمت چکائی تھی، ٹھیکہ داری کے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ عام ٹھیکہ داروں سے باقاعدہ کمیشن وصول کرتے ہیں۔ جو ٹھیکہ دار یہ فی صد ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں ان کے ٹھیکے خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ ہمیں بلدیہ کے ایک چھوٹے ٹھیکیدار نے حلفیہ طور پر یہ بتایا کہ ابراہیم نے ان کے منظور کئے جانے والے ایک ٹنڈر پر سپلائی اس لئے نہ ہونے دی کہ ٹھیکیدار نے منافع کا ۵۰ فیصد ابراہیم صاحب کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔

بلدیہ کے عوامی نمائندوں اور نوکر شاہی کے کارندوں نے عوامی ادارے کی جو درگت بنائی ہے اس کی داستانیں بہت طویل ہیں۔ محاسبہ کے ڈر سے بے خوف ان لوگوں نے عوام کی نمائندگی کا لیبل لگا کر اب تک صرف ان کا خون ہی چوسا ہے۔ اب عوامی نمائندوں کی نئی کھیپ آنے کی تیاری کر رہی ہے۔ وقت بتائے گا کہ وہ کونسی نئی مثالیں قائم کریں گے اور عوام کی نمائندگی کے نام پر واقعی نمائندگی کا حق ادا کریں گے یا صرف اپنی اقتصادیات مستحکم کرنے کے لئے عوام کا لہو فروخت کریں گے۔

■



مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو اپنے ہمراہیوں کے ساتھ نایک لانچ میں سوار ہونے جا رہے ہیں

الفتح نے پروفیسر غلام اعظم کو شکست سے ہمکنار کیا

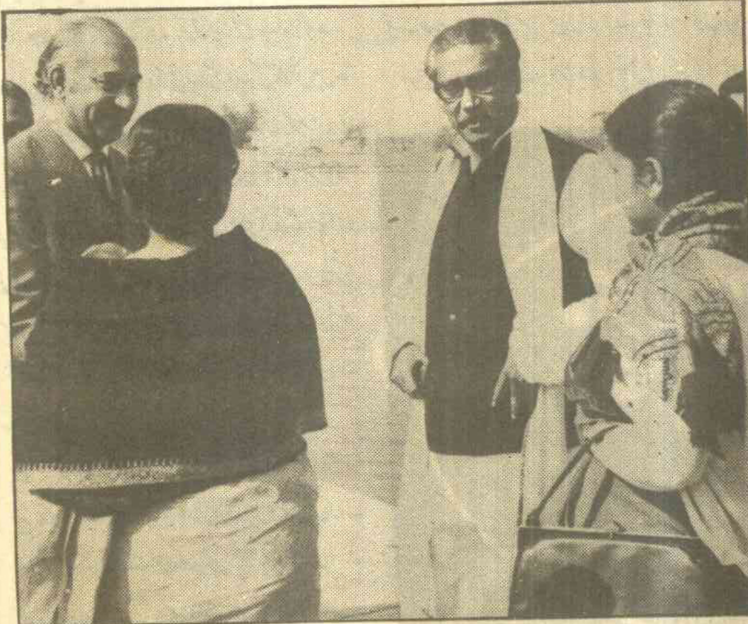
وہ مغربی پاکستان کے جذبات سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں

محمود شام

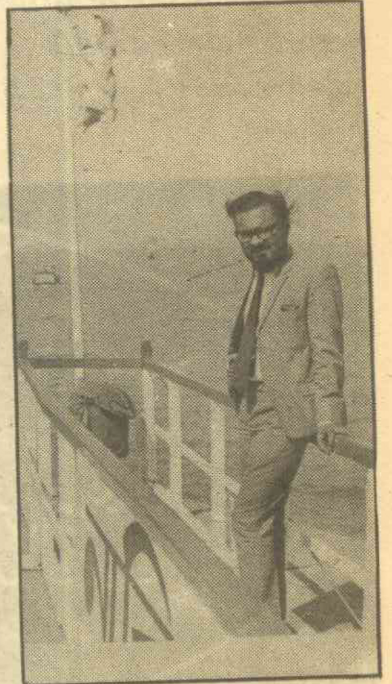
اس لانچ پر صرف نایک لانچ والوں کی نہیں دنیا بھر کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ نظریں اب بھی لگی ہوئی ہیں۔ وہ لوگ اب ایک لانچ پر نہیں، دو مختلف لانچوں پر سوار ہیں طوفان ہیں دونوں لانچیں ہچکولے لے رہی ہیں۔ دل دھڑک رہے ہیں اور .....)

یہ لانچ ہمارے آگے آگے تھی۔ اور اب ستر میل تک آنے کے بعد واپس ڈھاکے کی طرف چل پڑے تھے کسی صاحب نے بتایا تھا کہ ہم رنگ پور آگئے ہیں الگ ایک چھوٹی سی لانچ میں پنجاب عوامی لیگ کے برکت سلیمی اور حامد سرفراز ہیں۔ وہ ہماری لانچ کا پیچھا کر کے ہیں۔ میگھنا بڑے سکون سے بہہ رہا ہے۔ ماہی گیروں کے "نوکے" نان شبینہ کی تلاش میں جال لٹکائے لہروں کے رحم و کرم پر بیٹھے ہیں۔ لانچ کا یہ ستر میل کا سفر۔ پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے رہنماؤں اور ارکان اسمبلی کو کتنے انچ آگے لایا ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ میچ ڈرا ہونے کی کیفیت نظر آرہی تھی۔ لوگ باتیں کر کر کے تھک چکے ہیں۔ مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات۔ کرنسی۔ ٹیکسیشن۔ بیرونی ملکی امداد و غیر ملکی تجارت۔ یوں لگتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے یہ رہنما مشرقی پاکستان کی طرح مغربی پاکستان کو بھی ایک یونٹ کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ملک میں غیر ممالک سے تجارت کرنے والے صرف دو گروپ ہی ہوں گے۔ ان کے لئے خارجہ پالیسی کی حدود کافی ہیں ان سے یہ غرض بھی کیا جا رہا ہے کہ اب تو آپ کو اتنی اکثریت حاصل ہے آپ مرکز میں حکومت بنا سکتے ہیں۔ مرکز میں آئیں اور مشرقی پاکستان کے لئے جو کچھ بھی آپ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ اس طرح پانچ خارجہ پالیسیاں بن جائیں گی۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ حب الوطنی اور ملک کی سلامتی کا ٹھیکہ صرف مغربی پاکستان نے نہیں اٹھا رکھا ہے۔ اب ہمیں اگر اپنے صوبے کے لئے کچھ کرنے کا موقع ملا ہے تو ملک کی سلامتی کیوں خطرے میں پڑنے لگی ہے۔ ہم جو قابل عمل خارجہ پالیسی بنائیں گے، اس کی حدود کے اندر ہی صوبے غیر ملکی تجارت اور غیر ملکی امداد کے سلسلے میں بات چیت کر سکیں گے۔

بھٹو اور مجیب صحن سے اتر کر کیبن میں چلے گئے ہیں کیونکہ خنکی بڑھ گئی ہے۔ عوامی لیگ کے نمائندے بظاہر یہ احساس دلا رہے ہیں کہ ۲۳ سال کے مسلسل جبر کے بعد اب انہیں اپنی قسمت خود سنوارنے کا موقع ملا ہے تو اس میں وہ ایک انچ بھی مصالحت نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں وہ مغربی پاکستان کے جذبات سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے



مسٹر بھٹو، مجیب اور عوامی لیگ کی خاتون رہنماؤں کے ساتھ دریا کے کنارے



مضمون نگار (محمود شام) نایک لانچ پر

طوفان میں دونوں لانچیں ہچکولے لے رہی ہیں

ہیں۔ یہاں موجود حضرات میں سے صرف عوامی لیگ کے سیکرٹری جنرل قمرالزماں تو مغربی پاکستان کے کئی مفصل دورے کر چکے ہیں۔ انہیں مغربی پاکستان کے لوگوں کے جذبات کا علم ہے۔ اس لئے وہ کچھ نرم بھی ہیں۔ باقی رہے شیخ صاحب



قمرالزماں مسٹر بھٹو کے ساتھ

۱۹۶۹ء میں رہائی کے بعد لاہور سے ہوتے ہوئے گول میز کانفرنس میں گئے۔ پھر کراچی میں آئے تو جی ایم سید سے معاہدہ کر گئے۔ اس کے بعد پھر ۱۹۷۰ء میں آئے۔ ایک جلسہ کر کے گئے۔ انہیں ان کے مغربی پاکستانی لیڈروں نے صحیح صورتحال سے آگاہ نہیں ہونے دیا۔

عوامی لیگ کا ایک گروپ ترقی پسند گروپ کہلاتا ہے۔ وہ پیپلز پارٹی کے ذرا زیادہ ترقی پسند گروپ کی تلاش میں تھا۔ ان کی ملاقات ہوئی اور مشرقی و مغربی پاکستان کے مزدوروں کسانوں کی جدوجہد کی بات ہوئی۔ ان لوگوں کا بھی ذکر آیا جو عوامی انقلاب کے لئے کام کر رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے ان سے پوچھا کہ مجیب صاحب ان کی جان کے کیوں درپے ہیں کیا وہ وطن دشمن ہیں۔ اس سلسلے میں عوامی لیگ کے ترقی پسند گروپ کا موقف واضح نہ تھا۔ اور وہ زیادہ کھل کر بات نہ کر سکے۔

عوامی لیگ کے طالب علم لیڈر طفیل احمد سے جو اب ایم۔ این۔ اے ہیں۔ میری بات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ اب طلبہ تحریک کی قیادت کن کے پاس ہے۔؟ تو انہوں نے جواب دیا۔ اب اس کی کیا ضرورت ہے۔؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ عوامی لیگ نے اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ فی الحال طلبہ کو اپنے حقوق کے لئے تحریک کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اس لئے کسی تنظیم کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا یہ خیال کس حد تک صحیح تھا اس کا جواب انہیں خود مل گیا ہوگا۔ عوامی لیگ کو حالیہ عوامی تحریک میں پھر طلبہ کی ضرورت پڑی کہ نہیں؟

بہت سے لوگ اس آئینی بحث سے اکتا کر نایب لانچ کے اوپر چڑھ گئے تھے اور مشرقی پاکستان کے حسن فطرت سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ہوا بڑی خوشگوار تھی۔ سرسبز درختوں ہرے بھرے کھیتوں میں گھرا گنگا لا بیگھنا اور اس پر "نوکے" اور مشرقی پاکستان کے عظیم مانجھی۔ ہماری ملاقات ظہیرالدین صاحب سے بھی ہوئی۔ جنہوں نے امیر جماعت اسلامی پروفیسر غلام اعظم کو شکست دی تھی۔ ان سے تعارف ہوا تو کہنے لگے ہمارا مقابلہ جماعت اسلامی سے تھا۔ اس لئے آپ کا "فتح" ہمارے بہت کام آیا۔ اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نام کے بارے میں سرورق پر جو دستاویز شائع ہوئی تھی اس کا میں نے بہت پروپیگنڈہ کیا۔ پھر وہ بتانے لگے کہ ایک بار۔ پروفیسر غلام اعظم۔ انتخابی مہم کے سلسلے میں دریا عبور کرنے کے لئے ایک ناؤ میں بیٹھے تو ناجیوں نے ان سے کہا کہ آپ ہمارے انتخابی نشان میں بیٹھ کر کیوں الیکشن لڑنے جا رہے ہیں آپ کو تو اپنے انتخابی نشان (پلڑے) میں بیٹھنا چاہیئے۔

اسی اثناء میں چائے اور میٹھے کا دور چل پڑا۔ اب ڈھاکہ نزدیک آ رہا تھا۔ پونے چار بج رہے تھے۔ نرائن گنج کا گھاٹ بھی دکھائی دینے لگا۔ بھٹو مجیب لانچ کنارے سے جا لگی اس سے ذرا آگے ہماری لانچ رکی۔ بھٹو صاحب پہلے لانچ سے نکلتے نظر آئے۔ ان کے چہرے پر کچھ اطمینان تھا۔ پھر مجیب صاحب لانچ کی سیڑھیوں کی طرف جاتے دکھائی دیئے انہوں نے جاتے جاتے بآواز بلند بنگالی میں کچھ کہا۔ جو



مسٹر بھٹو ماہرین کی ٹیم کے ہمراہ نایاب لانچ میں بیٹھے ہیں

ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ اس کے فوراً بعد لانچ سے اترنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ دونوں رہنماؤں کو اس وقت لیپن کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنی لانچ سے اتر کر گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ دور سے ان کے چہروں پر اطمینان جھلک رہا تھا۔

ہمیں ہاشمی صاحب کی سرخ گاڑی نے ہوٹل پہنچا دیا۔ الطاف رانا پہلے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دونوں بہت موڈ میں تھے۔ شیخ صاحب خدا حافظ کہہ کر جانے لگے تو انہیں بھٹو صاحب نے اوپر ساتھ کھینچ لیا۔ کہ آپ اب چائے پی کر جائیے گا۔ ہم ۱۱۳۴ انٹر کانٹی نینٹل میں بڑے بے تکلفانہ موڈ میں چائے پی اور پھر چلنے لگے تو بھٹو صاحب نے ضد کی کہ وہ نیچے تک چھوڑنے جائیں گے۔ اس پر شیخ صاحب نے کہا کہ یہ تو سلسلہ چلتا رہے گا۔ آپ مجھے نیچے چھوڑنے جائیں۔ پھر میں آپ کو اوپر۔ اس میں وقت گزر جائے گا۔ اب آپ بیٹھئے میں چلتا ہوں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ کچھ زیادہ نہیں اتنی بات ضرور طے ہوئی کہ بات چیت کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔ مجیب صاحب کوشش کریں گے کہ مغربی پاکستان آئیں۔ ممکن ہوا تو بھٹو صاحب دوبارہ مشرقی پاکستان آئیں گے۔ اسمبلی کے لئے تاریخ مقرر کرنے کا جہاں تک مسئلہ تھا۔ بھٹو صاحب جلدی اسمبلی کے اجلاس میں جانے کے حق میں نہیں۔ کیونکہ جس تیاری کے ساتھ اسمبلی میں جانا ہے، ابھی وہ نہیں ہوئی۔ لانچ والی ملاقات سے لوگوں کو زیادہ امیدیں وابستہ ہو گئیں تھیں۔ کیونکہ اس کے بعد کچھ ماحول خوشگوار رہا تھا۔

آج تھوڑی دیر بعد بھٹو صاحب کی پریس کانفرنس ہونا تھی۔ انٹر کانٹی نینٹل کے ایک گوشے میں۔ پریس کانفرنس کے مقررہ وقت سے پہلے ہی بہت رش ہو چکا تھا۔ مشرقی پاکستانی اور غیر ملکی اور مغربی پاکستان سے آئے ہوئے تمام اخبار نویس سوالات سے مسلح ہو کر آئے تھے۔ اس سے پہلے یہ سب لوگ آپس میں طے کر چکے تھے کہ کس کو کیا سوال پوچھنا ہے اور کس طرح سے مسٹر بھٹو کا گھیراؤ کرنا ہے۔ شہزاد منظر ڈھاکے میں مساوات کے نمائندہ خصوصی بتا رہے تھے کہ بھٹو صاحب کی پریس کانفرنس ہمیشہ اتنی ہی پر ہجوم ہوتی ہے۔ ایک صاحب کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ شیخ مجیب الرحمان کی طرف سے آتے ہیں، ان کی ڈیوٹی یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی پریس کانفرنس ٹیپ کر کے شیخ صاحب کو پہنچاتے ہیں تاکہ وہ اخبارات سے پہلے ہی پورا متن سن سکیں۔

تمام اخبار نویس قلم ہاتھ میں لئے۔ ٹیپ ریکارڈر فٹ کئے منتظر بیٹھے ہیں اور بھٹو صاحب آنے والے ہیں۔

(جاری ہے)

شیخ مجیب یا شیخ عجیب ؟



مرکز میں عبوری حکومت کے قیام سے موجودہ بحران ختم ہو جائے گا

افضل صدیقی :

شیخ مجیب جن لوگوں کے نرغے میں گھر گئے ہیں انہوں نے انہیں شیخ عجیب بنا کر رکھ دیا ہے اور اب یہ شیخ عجیب جب آئینہ دیکھتے ہیں تو اپنی شکل بھی نہیں پہچان پاتے۔ انہوں نے متحدہ پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والے کی حیثیت سے جن خوابوں کی پرورش کی تھی وہ بکھر گئے ہیں انہوں نے بنگال کو کاٹ کر پاکستان کے ایک بازو کی تشکیل کے لئے جنگ لڑی تھی وہ مشرقی بنگال تھا۔ یہ مشرقی بنگال یا مشرقی پاکستان مملکتِ واحد کا ہی حصہ تھا۔ ان کے دل پر اس خیال کی پرچھائیں بھی نہ پڑی ہوگی کہ مشرقی پاکستان کو پورے پاکستان سے کاٹ کر آبادی کے لحاظ سے دنیا کا آٹھواں سب سے بڑا الگ اور آزاد ملک بنایا جا سکتا ہے۔ بنگلہ دیش کے تصور سے ہلکی سی کرن بھی ان کے ذہن میں نہ پھرتی ہوگی۔ قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر ۲۵ برس رہی ہوگی۔ اس زمانے میں وہ انقلابی نوجوان تھے طلبا کو منظم کرنے اور ان میں تحریک کی روح پھونکنے کا بہت بڑا کام انہوں نے انجام دیا ہے۔ وہ حسین شہید سہروردی کے قابل اعتماد پیرو کار رہے ہیں۔ جس طرح قمر الزماں، تاج الدین اور کمال حسین آج ان کے قابل اعتماد ساتھی ہیں۔ اسی طرح وہ جو کبھی سہروردی مرحوم کے رفیقِ خاص تھے اپنے قائد کے بارے میں وہ ہم سے بہت زیادہ جانتے ہوں گے کیا سہروردی یہی کچھ چاہتے تھے جو آج شیخ صاحب کر رہے ہیں ؟

قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں کہا تھا

"اگر ہم نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ہم بنگالی پنجابی یا سندھی پہلے ہیں اور مسلمان اور پاکستانی محض اتفاقی طور سے بن گئے ہیں تو یقین رکھئے پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

کیا شیخ صاحب بابائے قوم کا یہ اندیشہ آزمانے کے لئے ۴۸ برس کی عمر تک پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے ؟

یہ بات تو انہوں نے خود کبھی سوچی بھی نہ ہوگی لیکن آج ان کے فکر و خیال پر باہر والوں کا قبضہ ہے۔ ان کا ذہن ان کا اپنا نہیں رہا۔ پہلے وہ خود سوچتے تھے خود پالیسی بناتے تھے اور خود اس پر عمل کرتے اور کراتے تھے مگر اب وہ اس صلاحیت سے محروم کئے جا رہے ہیں۔ چھ نکات کو بھی وہ اپنی ہی تصنیف بتاتے ہیں۔ یہ چھ نکات انہوں نے لاہور میں جمہوریت پسندوں کی میٹنگ پیش کر کے دھماکہ کیا تھا۔ جمہوریت اور آئینی حکومت کا تصور ہی بدل کر رکھ دیا تھا اور جمہوریت کی ابتدائی لڑائی کا رخ ہی غلط سمت موڑ دیا تھا۔ یہ حالات کی ستم ظریفی اور حصول اقتدار کی اندھی حرص ہے کہ جن سیاست والوں نے چھ نکات میں سازش کی بو سونگھی تھی وہی ایوب خاں کی گول میز کانفرنس میں شیخ مجیب

پنڈگاں میں جو فیصلہ ہو چکا ہے اسے کون بدلے گا

کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ آج انہیں چھ نکات میں ملک اور قوم کی نجات نظر آ رہی ہے اور وہ شیخ مجیب کے گرد حصار باندھ رہے ہیں لیکن شیخ صاحب نے پورے ملک، پوری پاکستانی قوم اور ان تمام سیاست والوں سے نجات حاصل کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ جس نے ہر دردمند پاکستانی کو دہلا دیا ہے۔ مغربی پاکستان کے بعض لیڈر یہاں کے عوام کو یہ کہہ کر ورغلانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں

کہ ان سارے پریشان کن حالات کے ذمہ دار صرف مسٹر بھٹو ہیں۔ یہ وہ نام نہاد رہنما ہیں جو چاہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی طرح مغربی پاکستان میں بھی قومی وحدت کے تصور کو خاک میں ملا کر پراگندگی پھیلا دی جائے اور بالآخر تقسیم پاکستان کا امریکی خواب پورا ہونے دیا جائے۔

کیا یہ مٹھی بھر لوگ سب کچھ کر گزریں گے ؟ محض چند ڈالروں کی خاطر وہ لاکھوں انسانوں کی بے شمار قربانیوں پر پانی پھیر دیں گے۔

صدر نے دو مرتبہ شیخ مجیب کو تبادلۂ خیال کے لئے بلایا۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا۔ صدر نے باہم افہام و تفہیم کے لئے گول میز کانفرنس طلب کی۔ اس کا بھی انہوں نے بائیکاٹ کر دیا۔ صدر نے ۲۵ مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا عوامی مطالبہ مان لیا تو شیخ صاحب اس میں بھی غیر مشروط طور پر جانے کو تیار نہیں ظاہر ہے کہ جب مارشل لا اٹھا کر اقتدار ان کے حوالے کر دیا جائے گا تو پھر آئین سازی کے لئے قانونی ڈھانچہ کی بنیاد کہاں باقی رہے گی جس کو تسلیم کر کے تمام سیاسی جماعتوں نے الیکشن لڑا تھا۔ ایسی صورت میں کیا الیکشن ہی کالعدم نہیں ہو جائیں گے ؟ شیخ صاحب پہلے مرکز میں اپنی حکومت چاہتے ہیں۔ پھر وہ چھ نکاتی پروگرام کے مطابق آئین بنائیں گے اور وہ وہی کچھ مغربی پاکستان کے ساتھ کریں گے جو ان کے بقول مغربی پاکستان کے مرکزی حکومت

والے مشرقی پاکستان کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ آخر اب ان رسمی کارروائیوں کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ بہت کچھ تو اب بھی سول نافرمانی کی تحریک چلا کر وہ کر ہی رہے ہیں۔ اس صورتِ حال سے گھبرا کر مختلف ملکوں نے اپنے اپنے ماہرین اور باشندوں کو مشرقی پاکستان سے واپس بلا لیا ہے۔ اقوام متحدہ کے تمام ملازمین بھی مشرقی پاکستان چھوڑ رہے ہیں مگر امریکی ماہرین اور باشندے جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مشرقی پاکستان ہی میں دندناتے رہیں گے۔ وہائٹ ہاؤس سے انہیں یہی ہدایت ملی ہے۔ آخر شیخ صاحب کس کے زیر سایہ بنگلہ دیش کی حکمرانی کریں گے۔

شیخ صاحب امریکی دباؤ اور اپنی پارٹی کے انتہا پسندوں کے جوش کے آگے جھک تو گئے ہیں لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ غریب ماہی گیروں بدحال کسانوں اور مظلوم مزدوروں کی بہت بڑی اکثریت ایسی ہے جو دیہات میں رہتی ہے ان لوگوں نے چھ نکات کا مطلب سمجھ کر ان کی پارٹی کو ووٹ نہیں دیئے تھے وہ بے چارے تو ان نکات کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتے انہیں تو یہ باور کرایا گیا تھا کہ عوامی لیگ سوشلسٹ اقتصادی نظام ملک میں رائج کر کے کسانوں، مزدوروں اور ماہی گیروں کو ہر قسم کے ظلم اور استحصال سے نجات دلائے گی۔ اسی لئے انہوں نے ووٹ بھی دیئے تھے۔ انہیں معلوم ہے کہ مغربی پاکستان سے کٹ کر ان کی حالت سدھرنے کے بجائے اور بگڑ جائے گی اور جب ان پر یہ سازش کھلے گی کہ چھ نکات اور آزاد بنگلہ دیش کے نام پر اور مغربی پاکستانیوں سے نفرت کو ابھار کر انہیں امریکہ کے ہاتھ فروخت کیا جا رہا ہے تو وہ خود متحد ہو کر شیخ صاحب کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ بنگلہ بندھو اپنے پرستاروں کی نفرت کا جب نشانہ بنیں گے تو انہیں سوائے مغربی پاکستان کے اور کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

شیخ صاحب کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ آج اگر وہ چین کے گرد امریکہ کا حصار مضبوط کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کو داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہو گئے تو ان کے دیش کی حیثیت نوآبادی سے زیادہ نہیں ہوگی اور اقتصادی طور پر پنپنے کے تمام امکانات ختم ہو جائیں گے۔ آزادی اور نجات کے نام پر سول نافرمانی کی یہ تحریک عوام سے کھلی بغاوت ہے اور اس بغاوت کو محب

اُن کا ذہن اپنا نہیں رہا

وطن قوتیں کچل کر رکھ دیں گی۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شیخ مجیب اپنے آپ کو تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ وہ نہتے عوام کو فوج سے متصادم ہونے کی ترغیب دینے کے بجائے اپنی پارٹی کے انتہاپسندوں کا حلقہ توڑنے پر توجہ دیں تو زیادہ اچھا ہوگا اس لئے کہ ان کی دو شرطیں ایسی ہیں جن کو واپس لے کر اور قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر آمادہ ہو کر وہ اپنے انتہاپسندوں کے غیظ و غضب کو دعوت دینا پسند نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں یہی ایک چارۂ کار رہ جاتا ہے کہ صدر یحییٰ مارشل لا کے تحت ایک عبوری حکومت قائم کر دیں۔ اس کی مخالفت انتہاپسندوں کی طرف سے ہو سکتی ہے لیکن اس قسم کی حکومت میں شیخ صاحب پیپلز پارٹی کو شامل کرنے پر تیار نہ ہوں گے اور نہ مسٹر بھٹو مرکز میں عبوری حکومت کا قیام گوارا کریں گے بلکہ وہ اس کو ترجیح دیں گے کہ پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم کر دی جائے لیکن ان تمام امکانات کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہمارے بیوروکریٹس کس حد تک امریکہ کا دباؤ قبول کرتے ہیں۔ نیتاگان میں جو فیصلہ ہو چکا ہے اسے کون بدلے گا۔ صدر یحییٰ، شیخ مجیب الرحمٰن یا مسٹر بھٹو؟ شیخ صاحب نے تو اپنی چھ نکاتی ہٹ اور آزاد بنگلہ دیش کی رٹ اسی لئے اختیار کی ہے کہ امریکی مفادات پورے کریں۔ ان میں اس فیصلہ کو بدلنے اور امریکی دباؤ سے باہر نکلنے کی سکت نہیں ہے۔ یہ توقع مسٹر بھٹو سے کی جا سکتی ہے جو کسی صورت میں بھی پاکستان پر امریکی غلبہ نہیں دیکھنا چاہتے لیکن انہیں اس کام میں مشرقی پاکستان کے علاوہ مغربی پاکستان کے امریکہ نواز حلقوں کی طرف سے بھرپور مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں انہیں پھر عوام سے رابطہ پیدا کرنا ہوگا کیونکہ ان کی طاقت عوام ہی رہے ہیں۔

اصغر خاں، شیر علی خاں، نور خاں جیسے لوگوں کو ایسے بیانات کو اخبارات میں کافی ہوا دی جا رہی ہے جن میں صدر یحییٰ سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اقتدار شیخ صاحب کو سونپ دیں۔ کئی اخباروں نے اپنے اداریوں میں بھی ملک کی سلامتی اور وحدت کا واسطہ دے کر ان لوگوں کی تجویز پر عملدرآمد کا مشورہ صدر کو دیا ہے۔

تو کیا عبوری حکومت بن جائے گی اور مارشل لا آئین سازی کا مرحلہ مکمل ہونے تک برقرار رہے گا۔ سر دست تو یہی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا امکان کم ہے کہ شیخ صاحب عبوری حکومت کی تشکیل کی تجویز کو اپنے انتہاپسند رفقاء سے منوا لیں گے۔



ٹی وی کے لئے معیار کا لفظ عنقا ہو گیا ہے

— : ناظر : —

عشرہ محرم کے دوران ٹی وی کارپوریشن کے ناخداؤں نے موسیقی سے بھرپور اشتہار اور ننگی انگریزی فلمیں دکھا کر شہدائے کربلا اور عزاداران حسینؑ کی جو توہین کی ہے اس کی ہر طبقہ کی طرف سے مذمت کی جا رہی ہے پورے عشرے میں صرف جوش ملیح آبادی کے مرثیہ اور مجلس شام غریباں سے علامہ رشید ترابی کے خطاب کو چھوڑ کر کوئی بھی پروگرام کراچی ٹی وی سے ایسا نہ پیش کیا جا سکا جسے معیاری اور قابل تحسین قرار دیا جا سکے۔ عاشورہ پیر کے دن تھا اور اس روز ٹی وی کی تعطیل ہوتی ہے۔ محرم کی ساتویں تاریخ تک کارپردازان ٹی وی اپنے محرم کے پروگراموں میں یہ اعلان نہ کر سکے کہ پیر کو تعطیل نہیں ہو گی۔ اور اس روز پورے وقت صرف محرم سے متعلق ہی پروگرام پیش کئے جائیں گے۔ جب ہر طرف سے احتجاج اور مطالبوں نے زور باندھا۔ بھوک ہڑتالی جلوس اور مظاہروں کی دھمکیاں دی گئیں اور ایک مجلس سے خطاب کے دوران علامہ رشید ترابی نے بھی ٹی وی کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا تو اس کے اگلے روز ہی ٹی وی کے حکام کے کانوں پر جوں رینگی اور انہیں پیر کے دن کی تعطیل منسوخ کر کے محرم کے پروگرام دکھانے کا اعلان کرنا پڑا۔ لیکن افسوس ہے کہ عاشورہ پر بھی پورے وقت پروگرام نہ دکھائے جا سکے۔ ۸ بجے سے ۱۰½ بجے تک صرف ڈھائی گھنٹے کے پروگراموں میں آدھ گھنٹے تک خبریں اور فلمیں پیش ہوئیں۔ اس روز بھی صرف علامہ رشید ترابی کی مجلس شام غریباں کا پروگرام ہی کام کا تھا۔ باقی پروگرام بھرتی کے تھے۔ اور عجلت میں تیار کئے گئے تھے۔ حالانکہ عاشورہ ہی وہ دن تھا جب شام ۹ بجے سے رات ۱۲ بجے تک محرم کے خصوصی پروگرام ہونے چاہئیں تھے۔ اور ان چھ گھنٹے کے پروگراموں میں کسی سوز خواں یا مرثیہ خواں یا مقرروں کو موقع دینے کے بجائے شہر کی مختلف مجالس کے پروگرام ریکارڈ کر کے پیش کئے جاتے تو وہ زیادہ ناظرین کو اپیل کرتے مگر ٹی وی کے سفید ہاتھیوں میں اتنی عقل و فہم اور ذہانت ہوتی تب نا۔ کراچی ٹی وی اسٹیشن کے پاس ٹی وی آر کے لئے دو گاڑیاں ہیں۔ جن سے پورے عشرے میں بڑا اچھا کام لیا جا سکتا تھا۔

محسن بیگم، عزت لکھنوی اور ان کے ہمنواؤں کی نوحہ خوانی کا انداز بہت دلکش اور موثر ہے۔ حاضرین کی موجودگی کے بغیر ان کے علاوہ کسی بھی نوحہ خواں یا مرثیہ خواں کا دل پروگرام میں نہیں لگ سکتا۔ اور ناظرین صحیح طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ آدھ گھنٹے تک اگر ایک ہی سوز خواں سلام یا نوحہ پڑھتا رہے اور کیمرہ اسے مختلف زاویوں سے دکھاتا رہے تو ناظرین کے لئے یہ پورا عمل انتہائی اکتا دینے والا ہوتا ہے۔

یوم عاشورہ کے ڈھائی گھنٹے کے پروگراموں کے دوران تو شکر ہے کوئی اشتہار نہیں دکھایا گیا۔ اور نہ کوئی انگریزی فلم دکھائی گئی مگر باقی پورے عشرہ میں تمام اشتہارات دکھائے گئے۔ بہت سے اشتہار گانوں اور موسیقی کے ساتھ تھے۔ انگریزی فلموں میں نہ صرف پس منظری موسیقی شامل تھی بلکہ کرداروں کو شراب پیتے رقص کرتے اور مار دھاڑ کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا تھا۔ بہت سے عریاں مناظر بھی ان فلموں میں تھے۔ یہ فلمیں اور اشتہارات دکھاتے وقت ٹی وی کے حکام نے محرم کے مہینہ کے تقدس اور حرمت کو یکسر انداز کر دیا۔ اس عشرہ میں ضیا محی الدین شو اور لوسی شو جیسے ہنسنے ہنسانے والے پروگرام پیش نہ کر کے جس احتیاط اور دانش مندی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ اس پر موسیقی اور انگریزی فلموں نے پانی پھیر دیا۔

نویں محرم کو حضرت جوش ملیح آبادی کو مرثیہ سنانے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ ان سے کسی نے یہ درخواست نہیں کی کہ حضرت نو تصنیف مرثیہ پڑھئے گا۔ جوش صاحب نے پچھلے سال جو مرثیہ کہا تھا اور کئی مختلف محفلوں میں اور ریڈیو پر سنا چکے تھے۔ وہی مرثیہ انہوں نے ٹی وی پر پڑھ کر ثواب دارین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ غنیمت ہوا کہ جوش صاحب کا مرثیہ سننے کے لئے اسٹوڈیو میں حاضرین کا بھی اہتمام کر دیا گیا۔ ورنہ وہ تو قبرستان میں بیٹھ کر شعر سنانا کفر سمجھتے ہیں۔ ٹی وی والوں نے جو حاضرین جمع کئے تھے ان کی داد کی ریہرسل شاید پہلے نہیں کرائی گئی اسی وجہ سے بار بار جوش صاحب کے مصرعے داد کے بے ہنگم شور میں دبے جاتے تھے۔

زیڈ اے بخاری جب تک ریڈیو میں رہے اور ہر سال محرم کے عشرے میں میر انیس کے مرثیے پڑھتے رہے۔ ٹی وی والے بھی کبھی کبھی انہیں موقع دے دیتے ہیں۔ وہ خود اگر کراچی ٹی وی کے جنرل مینجر برقرار رہتے تو خود ہی داد خواہی کا موقع پیدا کر لیتے۔ اب تو وہ انہی حضرات کے رحم و کرم پر ہیں جن کے کبھی وہ سربراہ ہوا کرتے تھے۔ آٹھویں محرم کو انہوں نے مرثیہ پڑھا اور تحت اللفظ کی تمام خوبیوں کے ساتھ پڑھا۔ مگر افسوس کہ ان کے کمال فن کی داد دینے کے لئے ٹی وی والے حاضرین کا انتظام نہ کر سکے۔ بخاری صاحب کی آواز اور سانس میں بہ تقاضائے سن وہ کر و فر نہیں رہا جو اب سے دس بارہ سال پہلے پایا جاتا تھا۔

بدھ ۲ مارچ کو ضیا محی الدین شو نامی ورائٹی پروگرام میں اس ترتیب کے ساتھ مختلف شخصیتوں سے حاضرین و ناظرین کو ملوایا گیا۔ جوش ملیح آبادی، ضیا جالندھری، ملکہ پکھراج، شنتوش کمار، طاہرہ سید، بشیر ساریان اور ایمی مینوالا۔ اس پروگرام میں جوش کی زندگی کی کھلی کتاب پہلی مرتبہ میں مشرقی آئی۔ اب تک ان کی زیست تاکہ معاشی میں مقید تھی۔ پہلی مرتبہ۔ میں کھری کھری باتیں ہے۔ لیکن قوم شعروں بیرو ساتھ آگے بڑھتی ہے مصلحتوں۔ اگر وہ انانیت اور بھی بے روک جاتا ہے وہ جاگیرداروں نے جب محازم کا آلۂ کار بن جاتی

اُفشاں بنا کر جاوید ہاشمی نے مایوس کیا ہے

— : مظہر فخری : —

فلم "افشاں" سے تماشائیوں نے بہت سی نیک توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ یہ رجحان غیر فطری بھی نہ تھا کہ اس کے ڈائریکٹر جاوید ہاشمی ایک کہنہ مشق شخصیت کے مالک ہیں میں انہیں ذاتی طور پر متعدد بار مل چکا ہوں اور ان کی خوش اخلاقی کا نہ صرف معترف ہوں بلکہ حلقہ متاثرین میں سے بھی ہوں۔ اسی جذبے نے فلم افشاں دیکھنے پر مجبور کیا۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ مجھے ایسے عقیدت مند کو افشاں دیکھ کر سخت بوریت سے دوچار ہونا پڑا۔ فلم مجموعی طور پر کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ کا جوڑا کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ کہانی کا تسلسل نہ کیریکٹروں کا میل جول۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب نے جہاں کہیں مناسب سمجھا سین شروع کر دیا۔ لہری جیسا آرٹسٹ مٹی کا مادھو بنا ہوا ہے۔ دوسرا کوئی ہوتا تو ہوٹ ہو جاتا۔ لہری کو اس کے ماضی نے بچا لیا۔ ورنہ ہاشمی صاحب نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی اور تو اور وحید مراد اسکرین پر زندہ لاش کی عکاسی کر رہا تھا۔ بور کرتے میں شبنم وحید مراد سے بازی لے گئیں۔ تاہم طارق عزیز جہاں بھی آئے اپنے نقوش چھوڑ گئے۔ انہوں نے بہت حد تک اس ناکام فلم کا بھرم رکھا وہ مبارکباد کے مستحق ہیں اور ساتھ ہی عالیہ کی پرفارمنس پر بھی داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ فوٹوگرافی اور موسیقی کے ذمہ دار اصحاب ناشاد اور نذیر کی محنت قابل ذکر ہے المختصر طارق عزیز، عالیہ، ناشاد اور نذیر حسین نہ ہوتے تو جاوید ہاشمی کی یہ فلم ایک بڑے المیے سے نہ بچ سکتی۔ آج بھی ان کے بارے میں فلم دیکھنے والے یہ کہہ کر مسکرا رہے ہیں کہ ڈائریکٹر نے تمام فلم نیند کے خمار میں فلمائی ہے۔

کہتے تھے کہ ان کی شاعری ڈکشن ہے اور جوش کی شاعری ڈکشنری تو یہ کہاں تک درست ہے۔ جوش صاحب نے صاف کہہ دیا کہ مجاز ٹھیک کہتے تھے وہ خوامخواہ اس قول کو رد کر کے مجاز کے پرستاروں کا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے۔

جوش صاحب نے اٹھارہ عشق کئے اور اس کا اعتراف انہوں نے "الحمدللہ" کہہ کر کیا۔ ۱۷ عشق کامیاب رہے اپنے اٹھارہویں عشق کی ناکامی کا سبب بیان کرتے ہوئے جوش صاحب نے کہا محبوبہ کا باپ کم بخت اسے منہ میں دبا کر بھاگ گیا۔ اپنی عمر اور اپنی سرکش فطرت کے درمیان تصادم کا ذکر کرتے ہوئے جوش نے کہا شبیر حسن خاں خلقی آدمی ہے اور جوش ذرا لڑکے ہیں۔ انہوں نے جاگیرداری کو برا نہیں کہا۔ ان کی آواز میں ان کے آباؤ اجداد کا خون بول رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کسانوں اور مزدوروں پر رحم کھانے کے علاوہ اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ انقلاب کے گیت گانے والے شاعر سے جو خود بھی کبھی جاگیردار تھا اور جس کے آباؤ اجداد بھی جاگیردار تھے یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی حالت پر سرمایہ داروں کو رحم کی دعوت دیتا رہے۔ اور خود جاگیرداری کے سنگھاسن سے نیچے قدم نہ رکھے۔ اس پروگرام میں ضیا جالندھری بالکل بھرتی کے تھے اور شاید جوش صاحب گفتگو کی چھیڑ کے لئے بلائے گئے تھے۔ ملکہ پکھراج نے جدید نظم گا کر سنائی اور اپنی کشیدہ کاری کے نمونے بھی دکھائے انہوں نے جوش صاحب پر بڑی گہری چوٹ کی کہ دیکھ لیجئے مجھے دو کام آتے ہیں اور آپ کو صرف ایک کام آتا ہے۔ ضیاء نے سامعین میں بیٹھی ہوئی ملکہ پکھراج کی بیٹی طاہرہ سید سے بھی تعارف کرایا۔ اور انہوں نے اپنی ماں کی اجازت سے آرزو لکھنوی کی ایک غزل کا مطلع گا کر سنایا۔ طاہرہ ہو بہو اپنی ماں کی طرح گاتی ہیں۔ غزل کی گائیکی میں وہ اپنی ماں کی بڑی کامیاب پیروی کر رہی ہیں۔ ملکہ پکھراج اور طاہرہ سید کو کھل کر گانے کا اس طرح موقع نہیں دیا گیا جس طرح ایمی مینوالا کو ملا۔

ایمی نے دو رقص پیش کئے بقول جوش عضائی کی شاعری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ایمی کو اس فن پر قدرت حاصل ہے وہ کتھا کلی اور منی پوری ہر قسم کے رقص کی مہارت رکھتی ہیں مگر اس روز ان کے فن پر ان کا جسم بری طرح حاوی نظر آیا۔ شادی اور طلاق کے بعد ایمی کا جسم بری طرح پھیلا ہے۔ چھوٹا قد ہونے کی وجہ سے جسم کا بے ہنگم پھیلاؤ رقص کی نزاکتوں پر اور بھی زیادہ بار معلوم ہوتا ہے۔ رقص کے لئے جس سڈول اور کومل جسم کی ضرورت ہوتی ہے ایمی اس سے محروم ہوتی جارہی ہیں۔ ایمی کے دوسرے رقص پر ضیا محی الدین نے جوش صاحب کی رائے پوچھی تو وہ بے دھڑک کہہ اٹھے، یہ تو جمناسٹک تھی۔

بے چارہ بشیر ساربان جانسن کا چہیتا آجکل وہ ٹرک چلاتا ہے جو اسے امریکہ کا دورہ کرانے کے بعد اسے بھول جانے والے جانسن نے بھجوایا تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے بتایا کہ امریکہ میں تو اس کے دستخط لینے والوں کی لائن لگی رہتی تھی اور اب کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ بشیر سے ضیا نے پوچھا کہ کیا تم پھر امریکہ جانا پسند کرو گے تو اس نے یہ مصرع پڑھا ؎

ایسے ناقدروں کے گھر جانے سے مرجانا بھلا



کامن ویلتھ براڈ کاسٹنگ کے سیکرٹری جنرل مسٹر ایے کلارک کو
سے بائیں مسٹر کلارک، مسٹر سلطان احمد اور میزبان

بقیہ: ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

ویسے خود مختار (autonomous) ہوں گے۔

لیکن دفاع، خارجہ امور، غیر ملکی تجارت اور غیر ملکی امداد کے سلسلے میں اختیارات فیڈریشن کے پاس ہوں گے۔ مسلح افواج کا کیا ہوگا۔ یہ کچھ معلوم نہیں ہے۔ ایک افواہ یہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمن یہ چاہتے ہیں کہ افواج میں ایک ایسٹرن کمانڈ دوسری سنٹرل کمانڈ اور تیسری ناردرن کمانڈ ہو۔ سنٹرل کمانڈ سندھ اور بلوچستان کو ناردرن کمانڈ پنجاب اور سرحد کو کنٹرول کرے گی۔ دونوں حصوں کی اپنی اپنی فوج ہوگی۔

حالات کے دھارے نے ،، ایک طاقت اور شیخ مجیب الرحمن کی عددی اکثریت نے بالآخر باقی دو طاقتوں کو بھی اس نہج پر سوچنے پر مجبور کردیا ہے اور اب پاکستانی قوم کو اپنے آپ کو ان نئے انتظامات سے ذہنی طور پر ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ محب وطن قوتیں اگر اب متحد ہیں۔ اس ملک کے مزدور کسان اپنے حقوق کے لئے بیدار ہوں اور جدوجہد کریں تو اس انتظامی تقسیم کو دلوں کی تقسیم نہ بننے دیں۔ اور استحصال کو جاری نہ رہنے دیں۔ دونوں اکثریتی پارٹیاں سوشلسٹ معیشت کی حامی ہیں۔ اگر خلوص دل سے سوشلسٹ معیشت کو رائج کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دونوں حصوں کے عوام ایک دوسرے سے اجنبی رہیں کیونکہ سوشلسٹ معاشرے میں منزل ایک یعنی عوامی جمہوریت ہوتی ہے۔

بقیہ: الفتح انکشاف

بھی وافر تعداد میں دستیاب ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جہاز کی قیمت سے دوگنی قیمت کا ڈائریکٹر آف شپنگ کا وہ سرٹیفکیٹ نہیں ملا جس کے ذریعے لاکھوں روپے کا زر مبادلہ پاکستان سے برآمد کر کے غیر ممالک میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ہوتا کچھ یوں ہے کہ پچاس لاکھ روپے کی مالیت کا جہاز خرید کر ڈائریکٹر شپنگ سے اس سے دوگنی مالیت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر جو زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے اس کا نصف تو واقعی جہاز کی خریداری پر صرف ہوتا ہے۔ لیکن باقی نصف غیر ملکی بنکوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس طرح زرمبادلہ کی غیر ممالک کو ترسیل کا کام مکمل ہوتا ہے اور اس میں نوکرشاہی سرمایہ داروں کی پوری طرح ممد و معاون ہوتی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب ایوب خاں نے ملک پر پہلا مارشل لا لگاتے وقت زرمبادلہ کے ذخائر ظاہر کرنے کا حکم جاری کیا تھا تو اس وقت بھی اس گروپ کے پاس سے بڑی مقدار میں زرمبادلہ برآمد ہوا تھا اور ——— دوسرے مارشل لا کے بعد جب صدر یحیٰی نے زرمبادلہ کے ذخائر ظاہر کرنے کے احکامات جاری کئے تو اس وقت بھی اس گروپ کے پاس زرمبادلہ کثیر مقدار میں موجود تھا۔

معیشت کی بنیادیں مستحکم رکھنے کے لئے حکومت کو زرمبادلہ کے سلسلے میں سرمایہ داروں اور نوکرشاہی کی بدعنوانیوں اور بڑے پیمانے پر ہونے والے گھپلوں پر کڑی نگاہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں یونائیٹڈ اورینٹل اسٹیم شپ کمپنی اور اس قسم کے دوسرے اداروں کی حرکتوں کی باقاعدہ تحقیقات ناگزیر ہے ورنہ زرمبادلہ کی اس اسمگلنگ کے ہاتھوں ملکی معیشت کا پہاڑ جو سرمایہ دارانہ طرز معیشت کے ہاتھوں پہلے ہی ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ بہت جلد ریت کے ایک بے جان تودے کی مانند ہو کر رہ جائے گا۔

بقیہ: مزدور عظیم ہے خدایا

روٹی کے ٹکڑوں اور پھٹے پرانے کپڑوں سے بھی کیوں محروم کیا جارہا ہے۔ اپنے مسائل پر گفت و شنید اور مستقبل کے پروگرام کو مرتب کرنے کے لئے نوشہرو فیروز میں ۲ اپریل ۱۹۷۱ء کو ہاری مزدور کانفرنس ہو رہی ہے جس کی صدارت سندھ کے مشہور ہاری ورکر رئیس بروہی کریں گے ایم این اے میر علی احمد خاں تالپور۔ عوامی رہنما معراج محمد خاں اور ڈاکٹر شمیم زین الدین مہمان خصوصی ہوں گے کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کرنے کے لئے تنظیمی کمیٹی، مالیاتی کمیٹی، پبلسٹی کمیٹی وغیرہ بنالی گئی ہیں۔ تنظیمی کمیٹی کے کنوینر کامریڈ علی احمد میمن اور سیکریٹری مقبول احمد ستھ منتخب ہوئے ہیں۔